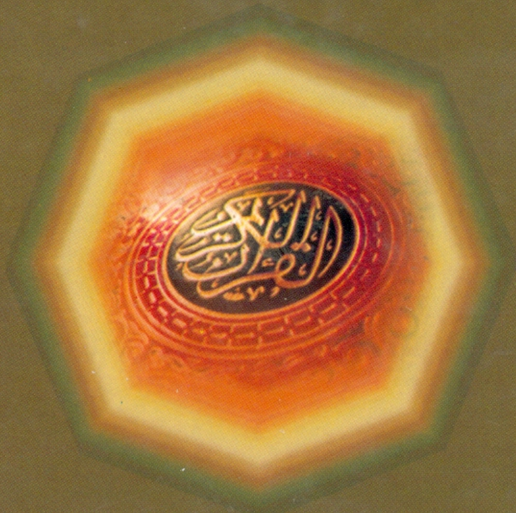
كُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ (البخاری)

اہلِ ایمان کی ذمہ داریاں

آیاتِ قرآنی کی روشنی میں

قرآن کریم میں اہل ایمان سے جن چیزوں کا مطالبہ کیا گیا ہے انکا ایک
مُنفرد اسلُوب میں ایک نپا تلا تجزیہ و تبصرہ، دِلوں کو تازگی، فرحت
اور نیا ولولہ عطاء کرنے والی اپنے موضُوع پر مُستند کِتاب



مؤلف
مولانا محمد ظفرِ اقبال
فاضِل و مدرس جامعہ اشرفیہ لاہور

بیتُ العُلوم
۲۰- نابھہ روڈ، پُرانی انارکلی لاہور- فون: ۷۳۵۲۲۸۳



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب

اہلِ ایمان کی ذمہ داریاں

آیات قرآنی کی روشنی میں

مؤلف

مولانا محمد ظفر اقبال

باہتمام

مولانا محمد ناظم اشرف

طباعت بارِ اول

فروری ۲۰۰۹

ناشر

بیت العلوم

ہیڈ آفس: ۲۰۔ نابھہ روڈ چوک پرانی انارکلی۔ لاہور فون: 7352483

برانچ: دکان نمبر ۱۴ الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ ۴۰ اردو بازار لاہور فون: 7235996

www.baitululoom.com

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وجہ تخلیق

نت نئے موضوعات اور تحقیقی عنوانات پر عمدہ اسلوب تحریر کے ساتھ کسی تخلیق کو منظر عام پر پیش کرنا تو اہل تحقیق اور اکابر کا کام ہوتا ہے، یہ ناکارہ تو طفل مکتب کہلانے کا بھی صحیح مستحق وحقدار نہیں، چہ جائیکہ کسی باذوق شخص کے سامنے اپنی کسی خامہ فرسائی کو پیش کرنے کی جرأت کر سکے اور اسے ایک کرب وامتحان میں مبتلا کر دے، تاہم اگر اہل تحقیق واکابر اس ناکارہ کی کسی تحریر کو کسی درجہ میں بھی درخور اعتناء سمجھتے ہیں تو یقیناً یہ ان کے بڑے پن کا ثبوت اور اس ناکارہ کی حوصلہ افزائی کہلائے گی۔

مورخہ ۲۲ نومبر ۲۰۰۶ء بروز بدھ بمطابق ۲۹ شوال ۱۴۲۷ھ کو ریڈیو پاکستان کی طرف سے ''اہل ایمان کی ذمہ داریاں' آیات قرآنی کی روشنی میں'' پر گفتگو کی دعوت دی گئی تھی، مذکورہ تاریخ کو حاضری ہوئی اور پروگرام وقت مقررہ پر نشر ہو گیا، لیکن اسی وقت دل میں یہ خواہش موجزن ہوئی کہ سات منٹ کی اس تحریر کو اگر تھوڑا سا پھیلا دیا جائے تو اگرچہ موضوع کا حق تو پھر بھی ادا نہیں ہو سکے گا لیکن ایک دلی خواہش کی تکمیل ضرور ہو جائے گی۔

چنانچہ مورخہ ۲۰ محرم الحرام ۱۴۲۸ھ کو اس کا ابتدائی خاکہ بنا کر تحریر کا آغاز کیا جو درمیان میں کئی عوارض کی وجہ سے تعطل کا شکار بھی رہا، تاہم پروردگار عالم کے فضل وکرم اور ان کی مہربانی سے مورخہ ۱۳ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ بروز پیر بمطابق ۲ اپریل ۲۰۰۷ء کو یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچ گیا اور اب قارئین کے ہاتھوں میں ہے، یاد رہے کہ ریڈیو کے لئے لکھی گئی تحریر کو کتاب کے آخر میں خلاصہ کے طور پر جوں کا توں پیش کر دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائیں اور تمام اہل ایمان کو اس کتاب سے وہ فائدہ عطاء فرمائیں جس نے مولف کو اپنی دلی خواہش کی تکمیل پر مجبور کیا۔

آمین

محمد ظفر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کائنات وجود ہر لحہ کسی نہ کسی تغیر کا شکار ہوتی رہتی ہے، تبدل سے بھرپور یہ کائناتِ وجود دن بدن زوال کی طرف بڑھتی چلی جارہی ہے اور ہر آنے والا دن نئی ذمہ داریاں، نئے احکام وفرائض، نئی صورتیں اور نئی سیرتیں لیکر ہمارے سامنے آموجود ہوتا ہے، کسی کو اولاد کی ذمہ داریوں نے پیسہ کی مشین بنا کر رکھ چھوڑا ہے اور کسی کو اولاد کے غم نے غیر اللہ کے آگے جبین نیاز کو جھکانے پر مجبور کر رکھا ہے، کسی پر بیوی کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے اور کوئی اپنے بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں نبھانے میں الجھا ہوا ہے، کسی کو تجارتی ذمہ داریوں نے ادھ موا کر کے رکھ چھوڑا ہے اور کسی پر معاشرتی ذمہ داریوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔

اور ایسا ہونا ایک فطری تقاضا، انسانیت کے لئے ناگزیر اور صداقت مصطفیٰ ﷺ کا ایک بین ثبوت ہے کہ اب سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل امام الانبیاء، رسول مصطفیٰ، نبی مجتبیٰ، حبیب مرتضیٰ، سرور کائنات، آقاءِ کل عالم جناب محمد رسول ﷺ فرما گئے تھے:

”تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری کے بارے قیامت کے دن پوچھا جائے گا، چنانچہ حکمرانِ وقت بھی ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی ذمہ داریوں سے متعلق پوچھ گچھ ہوگی، مرد اپنے اہل خانہ کا ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی ذمہ داریوں کے بارے سوال جواب ہوگا، عورت اپنے خاوند کے گھر بار کی ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی ذمہ داریوں سے متعلق پوچھا جائے گا، نوکر اپنے آقا کے مال کا ذمہ دار اور نگہبان ہے اور اس سے اس کی ذمہ داریوں کے متعلق حساب ہوگا“ (بخاری شریف: ۲۵۵۸)

گویا ”ذمہ داری“ ایک ایسی آفاقی حقیقت ہے جس سے ہر فرد کو واسطہ ضرور پڑتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس کی نوعیت مختلف ہوسکتی ہے اور ہر انسان کی ذمہ داریاں اسکی اپنی ذاتی زندگی کے مطابق ہوسکتی ہیں لیکن اس سے جان چرانا کسی کے لئے ممکن نہیں حتی کہ اگر

کوئی شخص ایسا ہو جس پر کوئی بیرونی ذمہ داری نہ ہو، تب بھی اپنے جسم کی اندرونی ضروریات کی تکمیل تو بہرحال اس کی ذمہ داری ہے اور اس سے اسی کے متعلق باز پرس ہوگی۔

شاید قرآن کریم کی اس بلیغ آیت میں اسی مضمون کو بیان کرتے ہوئے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔

''اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا''
(الاسراء:۳۶)

''بیشک کان، آنکھ اور دل (وغیرہ) سب چیزوں کے متعلق انسان سے باز پرس ہوگی''

انسان بیچارہ ظاہر بین ہے اور سمجھتا ہے کہ کان، آنکھ اور دل میں تو کوئی زبان نہیں ہوتی، ان سے سوال جواب چہ معنی دارد؟ لیکن اس کی اس ظاہر بینی اور اس سطحی سوال کا جواب دیتے ہوئے ''قلب قرآن'' سورۂ یٰسٓ میں قادر مطلق تکلم سرا ہوتا ہے۔

''اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ'' (یٰسٓ:۶۰)

''آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں ان کی کرتوتوں کے متعلق گواہی دیں گے''

لیجئے! ابھی تو صرف کان، آنکھ اور دل ہی کی بات ہو رہی تھی، یہاں ہاتھ اور پاؤں کو زبان دیئے جانے کا بھی ذکر آ گیا اور پہلے جملے میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی کہ منہ پر مہر لگا کر زبان کو بند کر دیا جائے گا اور ہر عضو کو وہ قادر مطلق گویائی عطا فرمائے گا جو یقیناً ہر چیز پر مکمل دسترس اور قدرت رکھتا ہے۔

بہرحال! بات یہاں سے نکلی کہ اگر کسی انسان پر کوئی بیرونی ذمہ داری نہ بھی ہو، تب بھی وہ اپنے جسم کی اندرونی ضروریات کا ذمہ دار ہے جس کا وہ جواب دہ ہوگا، اس موقع پر بخاری شریف کی ایک اہم ترین روایت پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن

جناب رسول اللہ ﷺ نے مجھے مخاطب کر کے ارشاد فرمایا، عبداللہ! مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ مسلسل، دن کو روزہ اور رات کو شب بیداری میں مشغول رہتے ہیں، کیا ایسا ہی ہے؟ میں نے عرض کیا جی! یارسول اللہ! نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ایسا نہ کیا کریں، بلکہ کبھی روزہ رکھ لیا کریں اور کبھی چھوڑ دیا کریں، کبھی شب بیداری کر لیا کریں اور سو بھی جایا کریں کیونکہ آپکے جسم کا بھی آپ پر حق ہے اور آپکی آنکھوں کا بھی آپ پر حق ہے، آپکی بیوی کا بھی آپ پر حق ہے اور آپ کے مہمان کا بھی آپ پر حق ہے......'' (بخاری شریف:۱۹۷۵)

کاش! اسلام کے روشن اور تابناک چہرے کو ''اعتدال پسندی اور روشن خیالی'' کے مضحکہ خیز دعوے سے داغ دار کرنے والوں کو کوئی یہ حدیث سناتا اور انہیں بتاتا کہ جس اسلام نے عبادات تک میں ''اعتدال'' کو برقرار رکھا ہے وہ اس کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو ہمیشہ سے اسے حاصل رہی ہے، دور جدید کے خوشنما اور خشک نعروں سے وہ اعتدال پسند نہیں ہوگا، اسلام کی اعتدال پسندی کا ایک بہترین مظہر حدیث کا یہ جملہ بھی ہے۔

''آپ کے جسم کا بھی آپ پر حق ہے اور آپکی آنکھوں کا بھی آپ پر حق ہے، آپکی بیوی کا بھی آپ پر حق ہے اور آپکے مہمان کا بھی آپ پر حق ہے''

اور اسی جملے سے مولف کا وہ دعویٰ بھی ثابت ہو جاتا ہے جو اس سے پہلے وہ دو مرتبہ دہرا چکا ہے کہ ہر انسان سے کم از کم اس کے جسمانی حقوق کے بارے تو ضرور ہی باز پرس ہوگی اور وہ اس کا جواب دہ ہوگا۔

معلوم ہوا کہ ذمہ داریوں کا سمندر اپنی موجوں میں ہر ایک کو لپیٹے ہوئے ہے تاہم کچھ ذمہ داریاں وہ بھی ہیں جنہیں ''ذمہ داری'' سمجھنے والے اور انہیں اپنے ''فرائض'' کی فہرست میں شامل کر کے انہیں خاطر خواہ حیثیت واہمیت دینے والے افراد انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، اور پھر ان ذمہ داریوں کی تکمیل کرنے والے کسی خوش نصیب سے آپکی ملاقات

ہو جائے تو آپ کو اپنی خوش نصیبی کا بھی یقین کر لینا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ مؤلف کے مخاطب بات کی تہہ تک پہنچ کر یہ سمجھنے میں قطعاً دشواری محسوس نہ کریں گے کہ اس سے اس کی مراد وہ ذمہ داریاں اور فرائض ہیں جن کا قرآن کریم اہل ایمان سے مطالبہ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اہل ایمان ان ذمہ داریوں کو نبھائیں اور ان فرائض کی تکمیل خوش دلی اور دل جمعی کے ساتھ کریں۔

اس موقع پر مولف کو یہ کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی بھی انسان اپنی بیرونی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں متعلقہ افراد سے کسی خراج تحسین کا متمنی نہیں ہوتا اور نہ ہی کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی کے اہل خانہ نے اسے ''تکمیل فرائض ایوارڈ'' سے نوازا ہو گو کہ اسلام یہاں بھی اسے محروم نہیں کرتا اور اسے قدم قدم پر صدقہ کا ثواب مرحمت فرماتا ہے تاہم یہ بات قابل غور ہے کہ پھر اپنے روحانی و جسمانی فرائض کی تکمیل میں انسان ''چونکہ اور چنانچہ'' کی بھول بھلیوں میں کیوں گھومتا رہتا ہے؟ وہ ''کیوں'' کی دلدل سے نکل کر ''کیا'' کی وادی میں قدم کیوں نہیں رکھتا؟ اور اپنی ان ذمہ داریوں کو بے چوں و چرا کیوں نہیں ادا کرتا جن کا قرآن اس سے مطالبہ کرتا ہے؟ اس کا جواب سوچنا میرے ہر مخاطب کی ذمہ داری ہے، میں اپنی ذمہ داری پوری کر کے آگے کو روانہ ہوتا ہوں۔

سب سے پہلی ذمہ داری

حفاظت ایمان

ہر وہ شخص جس نے کلمہ طیبہ پڑھ رکھا ہے اور اسے اللہ کی طرف سے پیدائشی یا اختیاری طور پر اسلام و ایمان کی نعمت عطاء ہوئی ہو، اس کی قدر، حفاظت اور اس پر شکر ادا کرنا اس کی ذمہ داری ہے جس کا وہ روز قیامت جواب دہ ہوگا اور اس سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے تمہیں ایمان کی جو نعمت عظمیٰ عطا فرمائی تھی، تم نے اس کی کیا قدر دانی کی؟ اس کی حفاظت میں تم کتنے کامیاب ہوئے؟ اس پر شکر ادا کرنے کی بھی تمہیں کبھی توفیق ہوئی؟ قدم قدم اور موڑ موڑ پر ایمان کے ڈاکوؤں کے نرغے میں گھر کر تم نے متاع ایمان کا کیا سودا کیا؟ زندگی کے ہر شعبے میں شیطانی شکنجوں میں پھنس کر تم نے ایمان کی کیا قیمت چکائی؟ زر، زن اور زمین کے چکر میں تم نے کتنی مرتبہ اسلام و ایمان کو پس پشت ڈالا؟ نوکری اور چھوکری کے لالچ میں، بیرون ملک جانے کی آرزو میں اور اپنی ذہنی وجسمانی آزادی و بلوغت کے لئے تم نے کتنی مرتبہ اپنے آپکو ''قادیانی'' لکھوایا؟ دنیا کے چند روزہ فائدے کی خاطر تم نے اپنی روحانی پونجی کو کس طاق نسیان میں رکھ چھوڑا تھا؟

تمہارے پیغمبر (ﷺ) نے فرمایا تھا۔

''من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فان لم يستطع فبلسانه و ان لم يستطع فبقلبه و ذلك اضعف الايمان''

(ترمذی شریف:۲:۲۱۷)

''تم میں سے جو شخص کوئی برائی ہوتے ہوئے دیکھے، اسے چاہئے کہ اپنی عملی طاقت کے ذریعے اسے بدل دے، اگر ایسا نہ کرسکے تو اپنی لسانی طاقت کے ذریعے اسے بدل دے، ورنہ کم از کم دل میں تو اسے برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے ہلکا اور کمزور درجہ ہے''

کیا تم میں اس کمزور درجہ کا بھی ایمان پایا جاتا تھا؟ تم نے اپنی زندگی میں ایمان کو کیا اہمیت دی تھی؟ کیا تم میں اپنے ایمان سے جسم و جان سے بڑھ کر محبت تھی؟ اے کاش! کبھی وقت نکال کر بلکہ چھین کر ہم ان سوالات کا جواب بھی سوچ سکیں اور کچھ اس کی فکر بھی کر سکیں۔

ایمان کیا ہے؟

وہ ایمان، جس کی حفاظت پر اتنا زور دیا جا رہا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت و ماہیت سے بھی پردہ اٹھایا جائے اور بتایا جائے کہ ''ایمان'' کسے کہتے ہیں اور یہ کب دل میں آتا ہے؟ زندگی پر اس کے ہونے سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ نیز اس کی ضرورت کا وہ کون سا قرآنی حوالہ ہے جس کی بناء پر اسے اہل ایمان کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے تو اس کے لئے سب سے پہلے ہمیں سورہ مبارکہ نساء کی مندرجہ ذیل آیت پر غور کرنا ہوگا، ارشاد ربانی ہے۔

''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ'' (النساء:۱۳۶)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے پیغمبر پر لائے ہوئے ایمان کی حفاظت کرو اور اس کتاب کے ایمان کی جو اللہ نے تدریجاً اپنے پیغمبر پر نازل فرمائی اور اس کتاب کے ایمان کی جسے اس سے پہلے اللہ نے یکبارگی ہی نازل فرمایا''

ظاہر ہے کہ ''یایھا الذین آمنوا'' کہہ کر جن لوگوں کو اپنا مخاطب بنایا جا رہا ہے، وہ اہل ایمان ہی ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں ''آمِنوا'' کا حکم جو دیا گیا ہے، اس کا اس کے علاوہ اور کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ اس ایمان پر ثابت قدم رہنا بھی مقصود اور مطلوب ہے جسے ہم نے ''حفاظت ایمان'' کے عام فہم مفہوم سے تعبیر کیا ہے اور فی الجملہ قدیم و جدید مفسرین کے اقوال سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے چنانچہ تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۵۷۰ اس کا ایک مضبوط ترین حوالہ ہے۔

یہی وہ چیز ہے جس کا مطالبہ وجہ تخلیق کائنات، حضور نبی مکرم سرور دو عالم ﷺ سے کرتے ہوئے انتہائی بلیغ انداز میں فرمایا گیا۔

"وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ" (الشوریٰ:۱۵)

"جیسا کہ آپکو حکم دیا گیا ہے، ثابت قدم رہیں"

اس نہج پر سوچ کر دیکھا جائے تو فکر کا جمود دور ہونے میں انشاء اللہ مدد ملے گی کہ آخر ایمان کتنی بڑی دولت ہے جس پر استقامت اور اسکی حفاظت کی تاکید سرورانبیاء ﷺ جیسی ہستی کو کی جارہی ہے جن کی جوتیوں کی خاک کی برکت سے ہمیں یہ بے بہا دولت نصیب ہوئی ہے اور خود سرور ہر عالم ﷺ فرمایا کرتے تھے۔

"قل امنت بالله ثم استقم"

"پہلے دولت ایمان سے مالا مال ہو جاؤ، پھر اس کی حفاظت بھی کرو"

رہی یہ بات کہ "ایمان" کی صحیح، جامع اور مختصر و مکمل تعریف کیا ہے؟ تو مولف یہ سمجھنے میں قطعاً حق بجانب ہے کہ اس سلسلے میں مہبط وحی، منبع علوم اور سرچشمۂ وحی ﷺ کی بیان کردہ تعریف ہی اس معیار پر پورا اترنے کی صلاحیت رکھتی ہے جو آپ ﷺ نے ایک سائل کے جواب میں ارشاد فرمائی تھی اور بخاری شریف میں اس کے الفاظ یوں مروی ہیں۔

"الایمان ان تؤمن بالله وملئكته، و بلقائه، ورسله، وتؤمن بالبعث" (البخاری:۵۰)

"ایمان یہ ہے کہ آپ اللہ، اس کے فرشتوں، لقاءِ خداوندی، پیغمبروں اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا یقین رکھو"

اس روایت کو امام ابن ماجہؒ نے بھی اپنی سنن میں تخریج کیا ہے اور اس میں "کتابوں" پر ایمان لانے کا بھی تذکرہ ہے اور بعض احادیث میں "تقدیر" کے نوشتۂ خداوندی ہونے کا اعتقاد اور یقین بھی ایمانیات میں داخل کیا گیا ہے، اس اعتبار سے کل سات چیزیں ہیں جن پر کامل اعتقاد رکھنا ایمان کا اہم ترین اور لازمی جزو ہے اور ان میں سے کسی ایک کے انکار سے بھی انسان کو دائرہ اسلام میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا، ان ساتوں چیزوں کی مختصر وضاحت حسب ذیل ہے۔

۱۔ اللہ پر یقین کامل ہونا اور اسکا مطلب

ایمان کی تعریف میں سب سے پہلی اور اہم ترین چیز "اللہ پر یقین کامل" ہے لیکن اس کے متعلقات اتنے متنوع ہیں کہ انہیں بیان کرنا تقریباً ناممکن ہے تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ

عبادت کرتے ہوئے انسان کو اس بات کا یقین ہونا چاہئے کہ اللہ ہی عبادت کے لائق اور مستحق ہے، سجدہ کے قابل وہی ہے، جبین نیاز اور سر تسلیم اسی کے سامنے خم ہونا چاہئے، طواف صرف اسی کے گھر کا ہونا چاہئے، رزق کا مطالبہ اسی سے کرنا چاہئے، اولاد کی آرزو اسی کے سامنے پیش کرنی چاہئے، کاروباری اور گھریلو مسائل کا حل اسی کے پاس تلاش کرنا چاہیے، ازدواجی زندگی کا سکون اسی سے مانگنا چاہئے، علم میں اسی کو کامل سمجھنا چاہیے، اس کی قدرت کاملہ کا اعتقاد ذہن میں راسخ کرنا چاہئے، اس کی حکمت اور باریک بینی پر اپنی عقل نارسا کو نچھاور کر دینا چاہئے، اس کی تقدیر پر اپنی تدبیر کو قربان کو دینا چاہیے، اس کے دستور اور قانون کے سامنے اپنے دستور اور قانون کو لپیٹ دینا چاہیے اور اس بات کا دھیان رکھنا چاہئے کہ اللہ اس ذات کو کہا جاتا ہے جس میں تمام کمالات ''خواہ ہماری عقل ان تک پہنچ سکے یا وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اپنی موت آپ مرجائے'' موجود ہوں ہر عیب اور نقص و زوال ''جو ہمارے ذہن کی گرفت میں آسکے یا نہ آسکے'' سے مبرا و منزہ ہو اور اس کے بغیر کسی کا کچھ نہ ہو سکے جبکہ کسی کے ہوئے بغیر اس کا سب کچھ ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی ذات، صفات، کمالات، اختیارات اور کبریائی میں کسی کی ادنیٰ شرکت بھی گوارا نہیں کرتا اور اسے نا قابل معافی جرم قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے۔

''اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ'' (النساء:۴۸)

''بیشک اللہ اس گناہ کو کبھی معاف نہیں فرمائیگا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے، ہاں! اس کے علاوہ جس کا جو گناہ چاہے گا، معاف فرمادے گا''

۲۔ ملائکہ پر یقین کامل ہونا اور اس کا مطلب

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے تحت ایک ایسی نورانی مخلوق بھی پیدا فرما رکھی ہے جس میں عصیان و نافرمانی کا مادہ رکھا ہی نہیں گیا، یہی وجہ ہے کہ وہ نورانی مخلوق احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی کرنے کا سوچتی بھی نہیں، اس کی ذمہ داری صرف تعمیل و تکمیل حکم ہوتی ہے اور اسی کو قرآن کریم میں ایک خوبصورت پیرائے میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

''لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ'' (التحریم:٦)

''وہ احکام خداوندی کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا گیا ہو''

یہ مخلوق ذاتی طور پر کسی اختیار اور طاقت کی مالک نہیں، اس کے وجود کا اعتقاد رکھنا، اسے اللہ کی نورانی معصوم مخلوق سمجھنا اور امور فطرت میں ہر قسم کی دخل اندازی سے وراء سمجھنا ہی ان پر ''یقین کامل'' کا صحیح مفہوم ہے۔

۳۔ لقاء خداوندی پر یقین کامل اور اس کا مطلب

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا اہل جنت پر جو اظہار ہوگا اس کی مختلف صورتوں میں سے سب سے اہم چیز ''دیدار باری تعالیٰ'' کی دولت ہے جو ہر ایک کو درجہ بدرجہ حاصل ہوگی، یہ صحیح ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے ان کثافت سے آلود آنکھوں کو یہ نعمت عظمیٰ حاصل نہیں ہوسکتی کہ ارشاد ربانی ہے۔

''لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ'' (الانعام:۱۰۳)

''نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں، ہاں! وہ نگاہوں کا مکمل ادراک رکھتا ہے''

بلکہ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ بیداری کی حالت میں دنیا کی ان آنکھوں کے ساتھ لذت دیدار سے کسی نبی مرسل کو بھی فیض یاب نہیں کیا گیا تو اس کی دلیل کے طور پر سورۃ اعراف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دیدار خداوندی کی سعادت حاصل کرنے کی درخواست اور اللہ کے جواب کو پیش کیا جاسکتا ہے جو یقیناً آپکے ذہن میں متحضر ہوگیا ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں درخواست پیش کی کہ میں آپکی زیارت اسی دنیا میں رہتے ہوئے انہی آنکھوں سے کرنا چاہتا ہوں، اپنی زیارت سے مجھے فیض یاب فرمایئے، ارشاد ہوا کہ موسیٰ! تم دنیا کی ان کثافتوں میں کسی صورت میری زیارت سے شاد کام نہیں ہوسکتے، لیکن تمہاری خاطر اس عظیم الشان طور پہاڑ پر اپنی ایک ہلکی سی تجلی ڈالتا ہوں، اگر اس پہاڑ نے اسے برداشت کرلیا تو تم بھی میری ایک جھلک دیکھ سکو گے اور پھر

وہی ہوا جس کا ہونا یقینی تھا، بھلا پہاڑ اتنی بڑی اور پہاڑ جیسی ہمت کہاں سے لاتا کہ اپنے اوپر تجلی ربانی برداشت کرسکتا، ریزہ ریزہ ہوکر ہوا میں تحلیل ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام اپنے ہوش وحواس بھلا بیٹھے، تھوڑی دیر کے بعد جب حواس بحال ہوئے تو پروردگار کی تسبیح و تعظیم کا ترانہ زبان پر جاری تھا۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا قطعاً کسی صورت صحیح نہ ہوگا کہ اہل جنت کو جنت میں بھی یہ لذت اور نعمت حاصل نہ ہوگی، کیونکہ خود قرآن کریم ہی ہمارے عقائد کی اصلاح کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" (القیمہ :۲۲،۲۳)

"بہت سے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے"

اور یہ حدیث تو ہر معتمد اور مستند کتابِ حدیث میں موجود ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے آقاءِ کل عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔

"هل نری ربنا"

"کیا ہم اپنے پروردگار کی زیارت کرسکیں گے؟"

جواباً ارشاد ہوا کہ یہ بتاؤ! چودھویں رات کا چمکتا دمکتا، کھلتا ہوا اور خوبصورتی کا پیکر "چاند" دیکھنے میں کبھی کسی قسم کی مشقت ہوئی ہے یا وہ طبیعت پر بوجھ اور آنکھوں کے لئے مشکل ثابت ہوا ہے؟ ظاہر ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا جواب نفی میں ہی ہونا تھا، اس پر ارشاد ہوا کہ بس اسی طرح تم اپنے پروردگار کے دیدار میں کسی قسم کی مشقت محسوس نہیں کروگے، یادرہے کہ ایمان کی تعریف میں "لقاءِ خداوندی پر یقین کامل" کا یہی مطلب اور مفہوم ہے جیسا کہ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں بعض اکابر اور محدثین کی طرف اس کی نسبت بھی کی ہے۔

۴۔ رسولوں پر یقین کامل ہونا اور اس کا مطلب

ہدایت کا وہ سلسلہ جو آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کا امین وعلم بردار ہو، حضرت آدم علیہ السلام سے شروع کرکے نبی آخر الزماں، ختم المرسلین، سرور کونین، احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل کر دیا گیا اور ان دونوں کے درمیان ہزاہا افراد کو نبوت ورسالت کے عہدہ جلیلہ پر فائز کرکے

اقوام عالم کی ہدایت ورہنمائی کے لئے مبعوث کیا جاتا رہا، جن میں سے چند ایک کے نام ہمیں قرآن کریم سے بھی ملتے ہیں لیکن اکثر انبیاء ورسل کے نام اور کام پر اب تک پردہ پڑا ہوا ہے. جس کا تذکرہ خود قرآن کریم میں بھی کیا گیا ہے:

''وَرُسُلاً قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلاً لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ'' (النساء:۱۶۴)

''بہت سے رسولوں کا تذکرہ ہم آپ سے کر چکے اور کتنے ہی ابھی ایسے ہیں جن کا ہم نے آپ سے کوئی تذکرہ نہیں کیا''

اس حقیقت کو ذہن میں راسخ کر کے یہ آیت بھی ملاحظہ فرماتے جائیں۔

''لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْ رُّسُلِهٖ'' (البقرہ: ۲۸۵)

''ہم اللہ کے پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان بھی تفریق نہیں کرتے''

اور ان دونوں آیتوں کو ملا کر یہ نتیجہ اپنے عقائد کا حصہ بنایئے کہ اللہ نے مختلف اوقات میں بہت سے پیغمبر مبعوث فرمائے، جن کی قطعی اور حتمی تعداد بھی اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، تاہم تمام پیغمبر برحق تھے، گناہوں سے معصوم تھے، اللہ کے احکام مخلوق تک پہنچانے میں رابطہ کا فریضہ سرانجام دیا کرتے تھے اور اپنے اپنے زمانے میں ہر پیغمبر کی تعلیمات اسی طرح واجب العمل تھیں جیسے اس آخری دور میں آخری نبی جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل شدہ وحی ''جو قرآن وحدیث کی صورت میں آج تک محفوظ ہے'' واجب العمل ہے اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعوی دار جھوٹا اور کذاب وجہنمی ہے بلکہ امام ابوحنیفہؒ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے بعد مدعی نبوت کے خارج از اسلام ہونے میں تو کسی کو شبہ ہی نہیں، جو شخص اس مدعی نبوت سے اس کی نبوت پر دلیل کا مطالبہ کرے، میرے نزدیک وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا، کیونکہ ختم نبوت ایک ایسا قطعی عقیدہ ہے جس سے انحراف انسان کو ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں اسلام سے خارج کرنے کے لئے کافی سے زیادہ ہے۔

۵۔ مرنے کے بعد والی زندگی پر کامل یقین ہونا اور اس کا مطلب

دنیا اور اس میں موجود ہر چیز فناء کے گھاٹ اتر کر رہے گی، یہاں ثبات ''فقط اک تغیر کو

ہے" ورنہ ہر چیز رو بہ زوال، ہست سے نیست اور بود سے نابود کا سفر طے کر رہی ہے کیونکہ یہی زندگی سب کچھ نہیں، حقیقی زندگی تو جب ملتی ہے کہ انسان اس دنیا سے کوچ کر کے ایک نئی دنیا میں قدم رکھتا ہے، دار العمل سے نکل کر دار الجزاء میں پہنچتا ہے، دنیا کی کلفتوں سے نجات پا کر ہمیشہ کا عیش و آرام حاصل کرنے کو روانہ ہوتا ہے۔

گو کہ بعض نادان اور ناواقف اس پر ہمارا مذاق اڑاتے ہیں اور نعرہ مستانہ لگاتے ہیں

"بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

اپنے جاننے والوں کو دنیا کی رنگینیوں اور شادابیوں میں الجھانا اور اسی میں مگن رکھ کر خالق سے غافل کرنا ان کا سب سے محبوب مشغلہ ہوتا ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب ہم مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے اور ہمارے جسم کا ایک ذرہ بھی باقی نہ بچے گا، پھر ہم کیسے زندہ کیے جاسکیں گے؟ عقل سے یہ بات باہر ہے۔

ہمارا سمجھانا تو شاید ان پر اثر نہ کرے کہ ہم تو "مولویوں" کی باتیں سناتے ہیں اور انہیں یہ "مولویوں کے ڈھکوسلے" لگتے ہیں، آپ ہی انہیں سمجھا کر دیکھئے، شاید ان کے دل میں خوف خدا پیدا ہو جائے کہ بھلا جو ذات پانی کے ایک گندے اور ناپاک قطرے سے وجود عطا کرنے پر قادر ہے، وہ مٹی سے وجود عطا کرنے سے عاجز کیونکر ہوگئی؟ جس نے پانی پر تمہاری تصویر کشی کی تھی، وہی مصور اب اتنا اناڑی کیسے ہو گیا؟ کیا اس کا یہ فرمان تمہاری سماعت و بصارت سے کبھی نہیں ٹکرایا

"وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَءُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ"

(الروم:۲۷)

"اللہ وہی تو ہے جو پہلی مرتبہ بھی تخلیق فرماتا ہے اور دوبارہ بھی وہی اسے لوٹائے گا اور یہ تو اس کے لئے اور بھی زیادہ آسان ہے"

ظاہر ہے کہ نقش اول ہمیشہ مشکل ہوتا ہے، اس کے بعد اسی کام کو دوبارہ وسہ بارہ کرنا یقیناً انسان کے لئے بھی بہت آسان ہوتا ہے، پھر خدا کے لئے ایسا کرنا مشکل کیسے ہو گیا؟ اور تو کچھ نہیں، لیکن ہمیں یہ فکر کھائے جاتی ہے اور اندر سے یہ غم دیمک کی طرح چاٹے جاتا ہے کہ کہیں دوبارہ زندگی ملنے پر زبان سے یہ الفاظ نہ نکلنے لگیں۔

"یٰوَیۡلَنَا مَنۡ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا" (یٰسٓ:۵۲)

"ہائے افسوس! ہمیں ہماری قبروں سے کس نے اٹھا کھڑا کیا؟"

اگر ایسا ہوا تو یقیناً برا ہوگا، اس سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن میں اس بات کو اچھی طرح راسخ کرلے کہ مرنے کے بعد مجھے ایک اور زندگی ملے گی جس میں اچھے اعمال کی جزاء اور بری حرکات و جرائم کی سزا دی جائیگی۔

۶۔ کتابوں پر یقین کامل ہونا اور اس کا مطلب

اللہ کی وہ مرضی جس کے سانچے میں وہ اپنے بندوں کے روز و شب ڈھلے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے، وہ کوئی خلاف عقل یا خلاف فطرت چیز نہیں، انسانی احساسات و جذبات سے ہٹ کر کاغذی دنیا نہیں، انسانی ضروریات کے برعکس کوئی کتابی حیات نہیں اور نہ ہی انسانی پہنچ سے کسی فاصلے پر ہے۔

بلکہ ہر زمانے، ہر قوم اور ہر علاقے میں وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اللہ کی مرضیات پر مبنی آسمانی تعلیمات ہمیشہ بھیجی گئی ہیں جو انسانی فطرت و عقل کے عین مطابق، انسانی جذبات و احساسات سے ہم آہنگ اور ضروریات انسانی کی تکمیل میں مدد اور معاون ثابت ہوئیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان آسمانی تعلیمات کو کسی صحیفے میں لکھ کر کسی پہاڑ کی چوٹی یا کسی کنویں کی تہہ میں نہیں رکھ دیا گیا کہ ایک عام انسان اس تک رسائی ہی حاصل نہ کر سکے بلکہ وہ ہمیشہ انسان کی دسترس اور پہنچ میں رہیں۔

ان کتابوں "جنہیں ہم نے اللہ کی مرضی پر مبنی آسمانی تعلیمات سے تعبیر کیا ہے" اور صحائف میں سے ہر ایک اپنے اپنے زمانے میں اسی طرح واجب العمل اور زندگی گذارنے کا معتبر و مستند طریقہ رہا ہے جیسے فی زمانہ قرآن کریم پر عمل کرنا ہی ذریعہ نجات ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے آئین، اصول، ضابطہ حیات حتی کہ اس سے پہلے نازل شدہ آسمانی تعلیمات بھی اب ذریعہ نجات نہیں ہیں۔

تاہم اس بات کا یقین رکھنا ضروری ہے کہ اللہ نے جو مختلف کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے، وہ سب برحق تھے، قرآن کریم ان کے بیشتر مضامین کی تصدیق و تائید بھی کرتا ہے گو کہ اب وہ اپنی اصلی حالت پر برقرار نہیں رہے، زمانہ اور اہل زمانہ کے تغیرات اور دستبرد

نے انہیں ان کی پہلی صورت پر برقرار نہیں رکھا لیکن اللہ کی نازل کردہ سب کتابیں اور صحائف سچے، سچے اور مبنی برحق تھے، ہم ان میں سے بعض کو تسلیم اور بعض سے انکار کی راہ اختیار کرنا قطعاً غلط سمجھتے ہیں۔

۷۔ تقدیر پر کامل یقین ہونا اور اس کا مطلب

نظام کائنات پر انسان جتنا غور وفکر اور تدبر و تفکر کرتا ہے، اس پر نئے سے نئے در یچے کھلتے ہیں، نئے سے نئے انکشافات ہوتے ہیں اور انسان کو اپنی ''سابقہ جہالتوں'' سے آگاہی ہوتی رہتی ہے، بسا اوقات انسان جس سوچ اور رائے کو حرف آخر سمجھ رہا ہوتا ہے، بعد میں اسی کی تغلیط کرتا دکھائی دیتا ہے، جس علم پر وہ نازاں ہوتا ہے، بعد میں خود ہی کو طفل مکتب سمجھنے لگتا ہے، جس تحقیق پر اسے بہت گھمنڈ ہوتا ہے، بعد میں خود ہی اس کے پرخچے اڑانے لگتا ہے، اپنے جس فن و کمال پر اسے فخر ہوتا ہے، بعد میں وہی اسے نقص وزوال محسوس ہونے لگتا ہے۔

غور کر کے دیکھا جائے تو اپنے وقت کے جلیل القدر اور صاحب کتاب وشریعت پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعے میں ''جسے قرآن کریم نے مکمل دو رکوعوں میں بیان کیا ہے'' بھی اس سبق کو دہرایا گیا ہے اور بخاری شریف کی احادیث اس واقعے کو مزید نمایاں کرتی ہیں جو انہیں حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ حصول علم کے سفر کے سلسلے میں پیش آیا اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حضرت خضر علیہ السلام ایک ایسی صحیح سالم کشتی کا تختہ اکھاڑ کر الگ کر رہے ہیں جس کے مالک نے انہیں کرایہ لئے بغیر صرف ان کے احترام میں اپنی کشتی پر سوار کر لیا تھا، ایک ہنستے کھیلتے بچے کو گردن سے پکڑ کر زندگی کی قید سے آزاد کر دیا اور ایک آداب سے عاری قوم کی دیوار اجرت لئے بغیر ہاتھ پھیر کر ہی صحیح کر دی اور وہ اس سارے واقعے میں حضرت خضر علیہ السلام کے ان تعجب خیز بلکہ غصہ آمیز امور کو دیکھ کر اپنے او پر ضبط نہ کر سکے اور ہر مرتبہ انہیں اس پر ٹوکتے رہے۔

گوکہ شریعت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھی لیکن حقیقت حضرت خضر علیہ السلام کا ساتھ دے رہی تھی، شاید یہی وہ چیز ہے جو مولف کو اپنے قارئین کے ذہنوں میں دھکیلنا ہے کہ بسا اوقات ہمارے سامنے کچھ ایسے واقعات و حالات رونما ہوتے ہیں کہ ہم اللہ تک پر

اعتراض کرنے سے نہیں چوکتے، حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ حقائق تک ہماری رسائی نہیں ہوتی" اور نہ ہر ایک کے سامنے حقائق کا انکشاف کیا جا سکتا ہے' اور محض اپنی سطحیت کی بنیاد پر ہماری زبان اعتراض سے وہ کچھ نکل جاتا ہے جس سے انسان اپنے پیدا کرنے والے خالق و مالک تک پر تنقید کرنے سے باز نہیں آتا، اگر وہ بات سمجھ میں آ جائے جس کا ان سطور میں تذکرہ کیا گیا ہے تو بہت حد تک ذہن صاف ہو جائے اور مسئلہ تقدیر کی حقیقت بھی واضح ہو جائے۔

تبصرہ

یہ ہے وہ ایمان جس کی حفاظت اہل ایمان کی سب سے اولین ذمہ داری ہے اور قرآن کریم جس کا مطالبہ کرتا ہے، اب اس عنوان کو سورہ توبہ کی ایک آیت کی ترجمانی پر ختم کیا جاتا ہے جس میں ایمان کے درجہ، مقام و مرتبہ اور اہمیت پر بڑے خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے اور وہ یہ کہ

"کیا تم حجاج کرام کو پانی پلانے اور حرم شریف کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے کی سعادت کو اس شخص کی سعادت کی طرح سمجھتے ہو، جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لے آیا ہو اور راہ خداوندی میں جہاد بھی کرتا ہو، یاد رکھو! اللہ کی نگاہ میں یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے" (توبہ:۱۹)

☆......☆......☆......☆......☆

دوسری ذمہ داری

حلال و حرام، تفہیم و تحکیم

"اے حبیب ﷺ! آپ فرما دیجئے کہ ذرا یہ تو بتاؤ، اللہ نے تمہارے لئے جو رزق اتارا ہے، اور تم اپنی مرضی سے ان میں سے کچھ کو حرام اور کچھ کو حلال قرار دیتے ہو، کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دے رکھی ہے، یا تم اللہ کی طرف جھوٹی نسبت کر رہے ہو؟" (یونس:۵۹)

اہل ایمان کی وہ دوسری اور اہم ترین ذمہ داری جس کا قرآن کریم ان سے مطالبہ کرتا

ہے، یہ ہے کہ اللہ نے جس چیز کو حرام قرار دیا ہو، اپنی عقل میں اس کی کوئی حکمت آتی ہو یا نہ، اسے حرام سمجھے اور جس چیز کو اللہ نے حلال قرار دیا ہو، طبیعت اسے استعمال کرنے پر آمادہ ہوتی ہو یا نہ، اسے حلال ہی سمجھے، محض اپنی عقل نارسا یا اپنے ہی جیسے انسانوں کی سطحی ذہنیت پر بھروسہ کر کے حلال و حرام کا اختیار بندوں کو اپنے ہاتھ میں لینا ناجائز تو ہے ہی، اپنی حدود اور دائرہ اختیار سے باہر نکلنا بھی ہے، جرأت، جسارت، گستاخی اور بے باکی جیسے الفاظ بھی اس پر مکمل صادق آتے ہیں کیونکہ اسی موقع کے لئے پروردگار عالم کا یہ ارشاد ہے:

"وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ" (الطلاق:۱)

"جو شخص اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرتا ہے، وہ اپنی جان پر خود ظلم کرتا ہے"

بھلا سوچنے کی بات ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ "جنہیں اپنے اور بیگانے سب ہی ہمیشہ صادق و امین کہتے رہے ہیں" کتنی وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں

"حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے تاہم ان کے درمیان کچھ چیزیں شبہ میں ڈالنے والی بھی ہیں" (بخاری شریف)

اگر نگاہ نبوت سے اس مسئلہ کے حدود و ارجہ کو دیکھا جائے اور عالم محسوسات سے اسے تشبیہ دی جاسکے تو شاید اس سے بہتر کوئی تشبیہ و تمثیل نہ مل سکے کہ دنیا کا یہ اصول اور ضابطہ ہے کہ جانوروں کو چرانے کے لئے مخصوص جگہیں مقرر ہوتی ہیں، جنہیں "چراگاہ" کہا جاتا ہے، پھر چراگاہ میں بھی مختلف درجے ہوتے ہیں جن کی رعایت رکھنا مویشی مالکان کے لئے ضروری ہوتا ہے چنانچہ شاہی چراگاہ میں وہی جانور چرائے جاتے ہیں جو شاہی جانور ہوتے ہیں، عام لوگوں کے جانوروں کو اس کے قریب بھی جانے کی اجازت نہیں ہوتی، کیونکہ اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر جانور شاہی چراگاہ کے قریب چرنے کے لئے چھوڑ دیئے جائیں تو کہیں وہ شاہی چراگاہ میں ہی داخل نہ ہو جائیں، یوں ہی سمجھ لیجئے! کہ اللہ کی چراگاہ وہ امور ہیں جنہیں اس نے اپنے بندوں کے لئے حرام قرار دے رکھا ہے اس میں داخل ہونا تو بجا، اس کے قریب بھی نہیں جانا چاہئے تاکہ اس میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہی نہ رہے۔

اور یہی وہ مطالبہ ہے جسے قرآن کریم اپنی معجزانہ بلاغت کے ساتھ اپنے ہر مخاطب

کے سامنے دہراتا ہے اور چاہتا ہے کہ ایمان کا ہر دعوی دار اللہ کی حرام کردہ اشیاء کو حرام اور اس کی حلال کردہ اشیاء کو حلال سمجھے۔ اس سلسلے میں یہاں چند موٹی موٹی چیزیں اختصار کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔

حرمت شراب

اگر آپ کسی ایسے زمانے کا تصور کریں جہاں شراب پانی کی طرح استعمال کی جاتی ہو، باپ پینے والا اور بیٹا پلانے والا ہو، کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ ہو اور اس کے بغیر لوگوں کو اپنی زندگی بدمزہ، پھیکی اور نامکمل معلوم ہوتی ہو، تو آپ یقیناً یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ایک عام آدمی کی زبان سے صرف یہ سن کر ''شراب حرام کردی گئی'' وہ لوگ شراب سے اس قدر نفرت کرنے لگے کہ وہ جام جو ہونٹوں تک پہنچ چکا تھا لبوں کو ترستا اور پیاسا چھوڑ کر پیچھے ہٹا لیا جاتا ہے اور اسے گلی محلوں میں اتنا بہایا جاتا ہے کہ بارش کا گمان ہونے لگتا ہے۔

قانون سازی، روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے نام پر پوری امت اسلامیہ اور ملت ابراہیمی کو گناہ کی اندھیر نگری میں دھکیلنے والے عام طور پر وقتاً فوقتاً اور موجودہ حالات میں بڑی شدت کے ساتھ یہ سوال اٹھا رہے ہیں کہ شراب نوشی پر پابندی ختم ہوجانی چاہیے عرب کے پسماندہ علاقے کی غلیظ شراب اور دور حاضر کی امپورٹڈ شراب میں زمین آسمان کا فرق ہے، علماء کو جدید سائنسی دور کی روشن خیالی کا ساتھ دیتے ہوئے اس مسئلہ میں گنجائش پیدا کرنی چاہیے اور پھر ویسے بھی قرآن کریم میں شراب کو کہاں ''حرام'' قرار دیا گیا ہے؟ مولویوں کے ڈھکوسلوں میں آکر انسان کو اپنی جوانی خشک اور بیزار طریقے پر نہیں گذارنی چاہیے۔

یہ اور اس قسم کے دوسرے ایسے بہت سے مشورے علماء کو دیئے جا رہے ہیں جنہیں شرفاء کی مجلس میں بیان کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن اب یہ مشورے صرف ذہنوں کی قید میں جکڑے ہوئے نہیں رہے، میڈیا اور ذرائع ابلاغ کی بھرپور سرپرستی اسے لوگوں کی زبان پر لانے میں کامیاب ہو چکی ہے اور اسے اس بات پر اصرار ہے کہ ''تنگ نظری'' سے نکل کر عوامی امنگوں والا اسلام لانا ہوگا، اللہ کرے ایسا نہ ہو، لیکن دکھائی دے رہا ہے کہ شراب نوشی پر پابندی ختم کرنے کی پارلیمنٹ اور سرکاری سطح پر سازش شروع ہو چکی ہے اور یہ

کسی نتیجے پر پہنچ کر ہی دم لے گی۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

احکام شرعیہ کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ اہم ترین احکام میں خاص طور پر پہلے ذہن سازی کی جاتی ہے اور تدریجی مراحل سے گذارنے کے بعد پھر کوئی خاص حکم نازل کیا جاتا ہے، اسی بناء پر شراب کو یکدم اور اچانک حرام نہیں کر دیا گیا بلکہ سب سے اولین مرحلہ میں فرمایا گیا

"قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا" (البقرہ:۲۱۹)

"اے حبیب ﷺ! آپ فرما دیجئے کہ ان کا گناہ تو بہت بڑا ہے تاہم اس میں لوگوں کے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن ان کے فائدے کی نسبت گناہ زیادہ بڑا ہے"

احتیاط اور اشارہ کی زبان سمجھنے والے اس بات سے ناواقف نہیں کہ اس میں شراب کا گناہ زیادہ بتا کر اس کی نفرت دلوں میں بٹھانا مقصود ہے تاہم وضاحت کے ساتھ شراب کو یہاں حرام قرار نہیں دیا گیا۔

کچھ عرصے کے بعد ایک خاص واقعہ کی بناء پر "نماز" کے وقت کے لئے ایک خصوصی حکم نازل کرتے ہوئے فرمایا گیا

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ"

(النساء:۴۳)

"اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب بھی نہ جایا کرو"

اس حکم کی وجہ یہی کہ چونکہ نشے کی حالت میں انسان کو اپنی زبان پر قابو نہیں ہوتا اور اس کے حواس اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتے ہیں، اگر اس حالت میں نماز پڑھتے ہوئے زبان سے کوئی ایسی ویسی بات نکل جائے جس سے سلب ایمان کا خطرہ پیدا ہو جائے تو یہ بہت نقصان دہ امر ہوگا، اس لئے نماز کے اوقات میں اس پر جزوی پابندی لگا دی گئی تاہم حرمت کا حکم پھر بھی نہیں دیا گیا۔

اس کے بعد تیسرے مرحلے میں شراب کو سراپا گندگی قرار دیتے ہوئے اسے حرام قرار

دیدیا گیا اور اس سے بچنے کی تاکید یوں فرمائی گئی

"رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ"

(المائدہ:۹۰)

"شراب سراپا گندگی اور شیطانی عمل ہے، اس لئے اس سے بچو، تاکہ تم کامیاب ہو سکو"

اس آیت نے شراب کی حرمت پر قطعی مہر لگا دی، جسے اٹھانا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، خواہ وہ کسی حکومت کا سربراہ ہو، یا قوم کا کسی بھی حیثیت میں منتخب نمائندہ ہو، اسی طرح کسی انسان کا "خواہ وہ کوئی بھی ہو اور کسی بھی حیثیت کا مالک ہو" شراب پینا اس کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتی۔

☆......☆......☆......☆......☆

جب اندیشے حقیقت بن کر آنکھوں کے سامنے آنے لگیں تو انسان کو درد دل چھپانے کی بجائے بیان کر دینا چاہئے کہ کہنے سننے سے بھی غم ہلکا ہوتا اور بوجھ بٹتا ہے۔ ترمذی شریف کی وہ حدیث پڑھ کر تو رونگٹے کھڑے ہو گئے جس میں جناب نبی مکرم، سرور دو عالم ﷺ نے شراب پینے کو نزول مصائب و آلام کا ذریعہ قرار دیا ہے اور فرمایا کہ جب شراب پی جانی لگے تو سرخ آندھیوں، زلزلوں کے ذریعے زمین میں دھنسنے اور چہرے بگڑ جانے والی کیفیات کا انتظار کرو، ایک دوسری حدیث میں اسے اس لڑی سے تشبیہ دی گئی ہے جس کا دھاگہ ٹوٹ جانے سے اس کے دانے بکھر کر تیزی سے گر جاتے ہیں، اسی طرح فتنوں کی بھی لڑی بندھی ہوئی ہے، جب شراب نوشی وغیرہ جرائم کا ارتکاب کھلم کھلا ہونے لگے تو اس لڑی کا دھاگہ ٹوٹ کر فتنے بڑی تیزی سے بکھر کر پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

خدا کیلئے! اگر ساقی کوثر ﷺ کے ہاتھوں جام کوثر اور شراب طہور درکار ہو تو دنیا کی اس غلیظ شراب کے قریب بھی نہ جائیں خواہ وہ کتنی صفائی ستھرائی سے کشید کی گئی ہو، کتنی ہی عمدہ پیکنگ کی گئی ہو، اگر آپ اس بات کی ضمانت دیدیں کہ اس خانہ خراب کے قریب جا کر اپنے اندرون خانہ کو تباہ نہیں کریں گے تو یہ ناکارہ، روسیاہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر اس بات کی ضمانت پروردگار عالم پر اعتماد کر کے دینے کے لئے تیار ہے کہ ساقی کوثر کے ہاتھوں اسے کو

کا جام ضرور نصیب ہوگا اور اسے وہ شراب طہور نصیب ہوگی جس کے پینے سے ہوش وحواس میں کسی قسم کا تعطل نہ ہوگا، اور کوئی بیہودگی نہ ہونے پائے گی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ساقی کوثر ﷺ کے پیارے اور مبارک ہاتھوں سے جام کوثر سے سیراب فرمائے۔ آمین۔

حرمت سود

تجارت میں انسانی معیشت کی بقاء کا راز مضمر ہے، تجارت جتنی اچھی ہو، ملکی معیشت اتنی ہی اچھی ہوتی ہے، اور تجارتی سرگرمیاں جتنا تعطل یا جمود کا شکار ہوں، ملکی معیشت کا اسی مقدار و تناسب سے متاثر ہونا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، اس لئے ہر مسلمان کو اپنی تجارت کھری، عمدہ اور اصولوں کے مطابق بنالینا خود اس کے حق میں بھی مفید ہے اور پورے ملک کے لیے بھی۔

خود جناب رسول اللہ ﷺ اپنی جوانی میں "تجارت" ہی کو ذریعہ معاش کے طور پر اختیار کئے رہے اور اسے اپنی جسمانی ضروریات کی تکمیل کے لئے صرف عبادت نہیں، بلکہ اعلیٰ درجہ کی عبادت قرار دیتے ہوئے فرمایا

"التاجر الصدوق الامین مع النبیین و الصدیقین و الشہداء"

"سچا اور امانتدار تاجر قیامت کے دن انبیاء کرام، صدیقین اور شہداء کے انتہائی قریب ہوگا"

اس لئے اس کی اہمیت وحیثیت سے تو کسی صورت انکار نہیں کیا جاسکتا البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ زندگی کے اس اتنے بڑے شعبے کو بھی شریعت مطہرہ کی ہدایات سے خالی نہیں رکھا گیا اور موقع بہ موقع تجارت کی پاکیزگی اور دیانتداری سکھائی گئی ہے، ہر اس معاملے اور لین دین سے منع کر دیا گیا جس میں دھوکے کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو یا جس میں ثمن اور مبیع نامعلوم ہوں، یا جس میں فریقین میں سے کسی ایک کی رضامندی شامل نہ ہو، یا کوئی ایسی شق شامل کر دی گئی ہو جس سے فریقین میں سے کسی ایک کو نقصان ہونے کا اندیشہ بھی پایا جاتا ہو۔

کیا آپ دنیا کا کوئی ایسا مذہب جانتے ہیں جو اپنے پیروکاروں کے لئے اتنی دور کی

سوچ رکھتا ہو، زندگی کے ہر موڑ پر انکی رہنمائی کرتا ہو، کسی موقع پر انہیں تنہا چھوڑنے کے لئے راضی نہ ہو اور اس باریکی کے ساتھ ہدایات جاری کرتا ہو کہ انسان کی عقل دنگ رہ جائے اور یہ پکارنے پر مجبور ہو جائے کہ واقعی اللہ سے بڑھ کر مخلص کوئی نہیں ہو سکتا۔

اس مختصری تمہید کو اپنے سامنے رکھ کر آپ خود فیصلہ فرمایئے کہ جو شریعت اتنی حساس ہو، کیا وہ کسی انسان کو دوسرے کی غربت سے کھیلنے کی اجازت دے سکتی ہے؟ کیا وہ کسی انسان کو دوسرے کی بے بسی اور تنگدستی کا مذاق اڑانے کی اجازت دے سکتی ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو پھر سود جیسے بے برکت، غلط اور حرام معاملے کی اجازت کیسے دے سکتی ہے؟ جس میں سوائے اس کے "اپنے تنگدست بھائی کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھا کر گھر بیٹھے پیسوں کی مشین لگائی جاتی ہے" اور کیا ہے؟

ہم ایک طرف تو غریبوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کرتے ہوئے کاروبار زندگی معطل کر کے پورے ملک میں ایک دن کی چھٹی مناتے ہیں اور دوسری طرف ان ہی غریبوں کا خون چوس چوس کر اپنی تجوریاں بھرنے کی فکر میں ہلکان ہوتے رہتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مال و دولت کمانے کی حرص ہمیں بڑھاپے میں بھی جوان رکھتی ہے۔ ہم ان ہی غریبوں سے اپنے گھر کی چاکری کرواتے ہیں اور ان ہی کو یوں دھتکار دیتے ہیں جیسے یہ انسان نہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

آج ہمیں باور کروایا جاتا ہے کہ سود معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، اگر اسے اپنی تجارت اور تجارتی سرگرمیوں سے حرف غلط کی طرح نکالنے کی کوشش کی گئی تو ہم معاشی طور پر اتنے کمزور، پست، مفلوک الحال اور نادار ہو کر رہ جائیں گے کہ دوبارہ پنپنا ممکن نہیں رہے گا اور ہم ایک ایک لقمے کے لئے ترسنا شروع ہو جائیں گے جبکہ اگر حقیقت پسندی کے ساتھ تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو سود ریڑھ کی ہڈی نہیں، بلکہ ریڑھ کی ہڈی کو لگ جانے والی دیمک اور گھن ہے جو اندر ہی اندر اسے چاٹ کر کمزور کرتا جا رہا ہے اور ہم اپنے طور پر بہت خوش ہیں۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"سود و ربا میں اگر کوئی دوسرا عیب بھی اس کے سوا نہ ہوتا کہ اس کے

نتیجے میں چند افراد کا نفع اور پوری انسانیت کا نقصان ہے تو یہی اس کی ممانعت اور قابل نفرت ہونے کے لئے کافی تھا، حالانکہ اس میں اس کے علاوہ اور بھی معاشی خرابیاں اور روحانی تباہ کاریاں پائی جاتی ہیں۔

پہلے اس کو سمجھئے کہ سود کے ذریعے ملت کی تباہی اور خاص افراد کا نفع کیونکر ہے؟ سود و ربا کے مہاجنی اور فرسودہ طریقہ میں تو ایسا بھونڈا پن تھا کہ عام ملت کا ضرر اور کسی خاص فرد کا نفع ہر موٹی عقل والے کو بھی سمجھ میں آجاتا تھا، مگر آجکل کی نئی روشنی۔ جس کو نئی اندھیری کہنا زیادہ موزوں ہے، اس نے جس طرح شراب کو مشینوں میں صاف کر کے، چوری اور ڈاکہ کی نئی نئی صورتیں ایجاد کر کے، بدکاری و بے حیائی کے نئے نئے ڈھنگ نکال کر کے سب کو ایسا مہذب بنالیا ہے کہ سطحی نظر والوں کو اس کی اندرونی خرابیاں نظر نہ آئیں، اسی طرح ربا اور سود کے لئے بجائے شخصی دکانوں کے مشترک کمپنیاں بنائی ہیں جن کو "بینک" کہا جاتا ہے اور اب دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لئے بتلایا جاتا ہے کہ ربا کے اس جدید طریقے سے پوری ملت کا فائدہ ہے کیونکہ عوام جو اپنے روپے سے تجارت کرنا نہیں جانتے یا قلت سرمایہ کی بناء پر نہیں کر سکتے، ان سب کا روپیہ بینکوں میں جمع ہو کر ان میں سے ہر ایک کو قلیل ہی سہی کچھ نہ کچھ نفع سود کے نام سے مل جاتا ہے اور بڑے تاجروں کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ بینکوں سے سودی قرض لیکر بڑی تجارت کر کے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس طرح سود ایک ایسی مبارک چیز بن گئی کہ ساری ملت کے افراد کو اس سے نفع پہنچ رہا ہے" (تفسیر معارف القرآن ج اص ۶۷۱)

اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر اب سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۵ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

"جو لوگ سود خوری کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ قیامت کے دن اللہ کی بارگاہ میں اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جسے شیطان نے لپٹ

کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو، وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کا کہنا تھا کہ تجارت کا نفع بھی تو سود ہی کی طرح ہے، حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے، سو جس شخص تک نصیحت کی یہ بات اس کے رب کی طرف سے پہنچی اور وہ سودی لین دین سے باز آگیا تو جو کچھ پہلے ہو چکا وہ اسی کا ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہوگا، لیکن جو شخص اب کے بعد دوبارہ اس کی طرف لوٹ کر گیا تو یہ لوگ جہنمی ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ سود کو مٹاتا رہے گا اور زکوۃ و صدقات کے ذریعے مال کو بابرکت کرتا رہے گا، اللہ کسی ناشکرے اور گنہگار کو پسند نہیں کرتا......... اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سود کے تمام بقیہ معاملات کو ترک کردو، اگر تم میں ایمان موجود ہے، اگر تم ایسا نہ کرو گے تو پھر اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ (البقرہ: ۲۷۵ تا ۲۷۹)

ان آیات طیبہ کی روشنی میں ایک مسلمان اور مدعی ایمان کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ سود اور سودی معاملات سے حاصل ہونے والے مال کو اسی طرح حرام سمجھے جیسے اپنی ماں سے نکاح کرنا حرام سمجھتا ہے، اس میں کسی تاویل اور توجیہ کا سہارا لئے بغیر اس کی ابدی حرمت کا عقیدہ اپنے ایمان کا حصہ بنائے اور اس بات کا یقین رکھے کہ سود سے گو بظاہر مال میں کتنا ہی اضافہ ہو لیکن انجام کار اس میں سے برکت یوں اٹھالی جاتی ہے جیسے بلی، چوزے پر جھپٹ کر اسے لے اڑتی ہے اور مرغی دیکھتی ہی رہ جاتی ہے۔

اسلام و ایمان کے نام پر یہ ناکارہ، روسیاہ اپنے تمام بہن بھائیوں سے دست بستہ عرض کرتا ہے کہ خدا کے لئے جس طرح بھی ممکن ہو، اس بلائے بے درماں کا درماں ''جو موجود ہے اور علماء و حکماء امت اسے بڑی تفصیل سے بیان کر چکے ہیں'' تلاش کر کے اس سے اپنا پیچھا چھڑائیں کیونکہ آج کل تو ویسے ہی جدت پسندی کے نام پر ''سود کی حرمت'' والے قانون اور فیصلے ہوا میں اڑتے دکھائی دیتے ہیں، حکومتی سرپرستی میں اسے خوب رواج دیا جارہا ہے اور مسلمانوں کو قرضوں کے بوجھ تلے دبا دینے کی سازشیں اپنے عروج پر ہیں۔

آیئے! مل کر عہد کریں کہ سود کی لعنت سے سب سے پہلے اپنی زندگی، تجارت اور معیشت کو پاک کریں گے۔ اس کے بعد اپنے ملک وملت میں اس شعور کو اجاگر کرنے کے لئے اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ مصروف رہیں گے۔ انشاء اللہ۔

حرمت زنا

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع کیا، انہیں وجود بخشا، جنت کی نعمتوں سے سرفراز کیا اور انہیں وہ کچھ عطا فرمایا جس سے زیادہ کا تو بہت دور کی بات ہے، اتنے ہی کا تصور ہمارے لئے ناممکن ہے، تاہم انسان چونکہ اُنس کا محتاج ہے اور یہ اس کی فطری وطبعی ضرورت ہے، اس لئے خلاق عالم نے انہیں حضرت حواء علیہا السلام سے ''اُنس'' کی دولت عطا فرمائی اور حضرت آدم علیہ السلام کو احساس ہوا کہ اب ان کی وہ فطری ضرورت بھی پوری ہوگئی جس کی تشنگی اور خلاء، وہ اپنی زندگی میں محسوس کرتے تھے، قرآن کریم نے اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

> ''اے گروہ انسانیت! اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک
> جان کے ذریعے وجود عطا فرمایا، اور اسی سے اس کا جوڑا بھی پیدا فرمایا
> پھر ان دونوں سے بہت سے مرد وعورت پھیلا دیئے'' (النساء:۱)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسانی فطرت ہمیشہ کسی ہم دم کی جویا رہی ہے اور اس نے اپنی جنس مخالف میں ہمیشہ اپنے لئے کشش، جذب اور راحت محسوس کی ہے، ظاہر ہے کہ اس جذبے کی تسکین اور اپنی فطری ضرورت کی تکمیل کے لئے کوئی نہ کوئی قانون، اصول اور ضابطہ ضرور ہونا چاہئے ورنہ جہاں جس سے جب چاہے گا، انسان اپنے جذبے کو تسکین پہنچا لے گا اور اس سے بدامنی، انتشار اور دوسروں کی عزت وآبرو غیر محفوظ ہونے کا رجحان بڑھ جائیگا اور معاشرہ بے راہ روی کا شکار ہو جائیگا، حدود اللہ تو پامال ہوں گی ہی، ہماری بہنوں کی عزت وعصمت بھی بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گی۔

اسلامی شریعت کا اعتدال اور اس کی روشن خیالی ملاحظہ کیجئے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت میں اپنے لئے کشش محسوس کرتا ہے تو سمجھدار اور حد بلوغ کو طے کر چکنے والے دو خاندانی یا

غیر خاندانی افراد کے سامنے وہ اسے اپنے لئے شریک حیات کے طور پر قبول کرلے اور مناسب طریقوں اور خاندانی عزت پر حرف آنے سے بچنے والے ضابطوں کو استعمال کرتے ہوئے اس سے اپنے جذبات کی تسکین اور تکمیل کو اپنا شرعی حق بنالے، نہ صرف یہ کہ وہ ایک دوسرے کے لئے حلال ہو جاتے ہیں بلکہ مستند روایات کے مطابق اس پر وہ مستحق ثواب بھی قرار پاتے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ ہمارے مخاطب کے ذہن میں یہ سوال الجھن پیدا کرے کہ اپنے جذبات کی تکمیل پر ثواب کا کیا مطلب؟ تو بے تکلف عرض کیا جا سکتا ہے کہ یہی سوال جب صحابہ کرام ﷺ کے ذہنوں میں ابھرا اور اس نے الفاظ کا جامہ پہنا تو سرکار دو عالم ﷺ نے حکیمانہ طریقے سے انہیں سمجھاتے ہوئے ارشاد فرمایا یہ بتاؤ! اگر وہ شخص اللہ کے بتائے اور جائز کئے ہوئے اس طریقے کو چھوڑ کر کسی اور طریقے سے اپنے جذبات کو تسکین دیتا تو گنہگار ہوتا یا نہیں؟ صحابہ کرام ﷺ نے اثبات میں جواب دیا تو ارشاد ہوا کہ جب غلط طریقہ اختیار کرنے پر گناہ ہونا عام فہم بات ہے تو پھر جائز طریقہ اختیار کرنے پر ثواب ملنا بھی پروردگار کی شان جود وسخا کے عین مطابق ہے۔

حامل قلم یہ لکھنے میں قطعاً کوئی تکلف محسوس نہیں کرتا کہ جذبات واحساسات ہر ذی روح میں عام طور پر اور حیوانات میں خاص طور پر پائے جاتے ہیں، لیکن انسان اور دیگر حیوانات میں امتیاز اور فرق، نکاح کے اس پاکیزہ اور شرعی وفطری طریقے کے ذریعے ہوتا ہے جو انسان میں جھکی ہوئی نگاہوں اور شرمگاہ کی حفاظت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے انسانیت کو عطاء کیا گیا ہے کیونکہ اتنی بات تو واضح ہے کہ انسان کے علاوہ دیگر حیوانات شادی بیاہ، نکاح اور منگنی کے نام اور طریقوں سے بھی نا آشنا ہیں، انہیں اپنے جذبات کی تسکین سے سروکار ہے، خواہ وہ کسی بھی طریقے سے ہو، اب اگر انسان بھی اس رخ پر چل پڑے اور انسانیت کی حدود پھلانگتا ہوا کسی کی عصمت ریزی اور آبرو بربادی میں ملوث ہو جائے تو آپ خود ایمانداری کے ساتھ فیصلہ کیجئے کہ ایسا شخص سزا کے قابل ہے یا نہیں؟

جس شخص نے اللہ کی مقرر کردہ حدود کی پابندی نہیں کی، کیا وہ رحم کے قابل ہو سکتا ہے؟
جس شخص نے ایک معصوم عفت مآب بنت حوا کی عزت کو پامال کیا، کیا وہ رحم کے

قابل ہو سکتا ہے؟

جس شخص نے ایک باپ کا سر شرم سے نیچے جھکا دیا ہو، کیا وہ رحم کے قابل ہو سکتا ہے؟

جس شخص نے ایک خاندان کی پیشانی پر کلنک کا بدنما ٹیکہ لگا دیا ہو، کیا وہ رحم کے قابل ہو سکتا ہے؟

جس شخص نے فحاشی کا ارتکاب کیا ہو اور دیدہ ودانستہ، کیا وہ رحم کے قابل ہو سکتا ہے؟

جس شخص نے قانون فطرت سے بغاوت کی ہو، کیا وہ رحم کے قابل ہو سکتا ہے؟

خواہ اس نے یہ عمل فریق مخالف کی رضامندی، خوشنودی اور دلچسپی کی موجودگی میں سرانجام دیا ہو، یا زبردستی اس کی چادر عصمت کو تار تار کر دیا ہو، بہر دوصورت وہ مجرم ہے اور اسے سزا ملنا ایک ایسا تقاضا ہے جو فطرت سلیمہ کے مالک ہر شخص کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے، یقین کیجئے کہ اللہ کی پارلیمنٹ میں جس چیز کی حرمت کا فیصلہ ہو جائے، دنیا کی کوئی دوسری پارلیمنٹ اس میں ترمیم کا اختیار نہیں رکھتی، اگر دنیا کی کسی پارلیمنٹ نے ایسا کیا ہو" خواہ وہ کسی مسلمان ملک کی ہو یا کسی غیر مسلم کی" در پردہ وہ اللہ کے اختیارات میں اپنا عمل دخل ثابت کرنا چاہتی ہے جس کی سزا جلد یا بدیر اسے مل کر رہے گی۔

بھلا ہم قرآن کریم کی اس آیت کو کیسے فراموش کر سکتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں

"جو لوگ مسلمانوں میں فحاشی پھیلانے کو اچھا سمجھتے ہیں، ان کے لئے دنیا و آخرت میں بڑا اور دردناک عذاب تیار ہے" (النور:۱۹)

اس آیت میں فحاشی "پھیلانے والے" کے لئے عذاب کی نوعیت نہیں بیان کی گئی بلکہ اس کی "تحسین" کرنے والوں کی سزا بیان کی گئی ہے، پھر سوچ کر بتایئے گا کہ جو لوگ، افراد ادارے اور انجمنیں اس میں براہ راست ملوث ہوں گے، ان کا انجام بد کیا ہو گا؟

"حقوق نسواں" کا نعرہ بڑا پرفریب، خوشنما اور جاذب قلب و نظر ہونے کے باوجود خواتین کو ان کے ان حقوق سے محروم کئے ہوئے ہے جو کسی بھی خانہ دار عورت کو اسلام عطاء کرتا ہے، لیکن اس حقیقت کا کیا کیا جائے کہ ہماری خواتین "اگر برا نہ منائیں تو اپنی ناقص عقل کو بھی استعمال کئے بغیر" انہی نعروں میں اپنی ترقی کا راز مضمر سمجھتی ہیں اور اصل حقائق

سے آگاہ کرنے والوں کو اپنا دشمن، دقیانوسی، رجعت پسند، تنگ نظر اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی ہیں۔

میں اسلام کے نام پر اپنے نوجوان سے خاص طور پر عرض کروں گا۔

میرے محترم اور انتہائی قابل صد تکریم نوجوان!

جوانی، اللہ کی امانت ہے

جوانی، برائے عبادت ہے

جوانی برائے بغاوت نہیں

خدا کے لئے اس امانت کو خدا کی عبادت کے لئے وقف کر دیجئے اور اس کی بغاوت سے اپنے آپکو بچا لیجئے، ابدی کامیابیاں آپکے قدم چومنے کے لئے تیار موجود ہیں اور یہ تصور کرلیں کہ دنیا میں ہم حضرت یوسف علیہ السلام سے بڑھ کر حسین نہیں ہو سکتے اور نہ زلیخا کے منصب پر پہنچنے والی کوئی حسن کی شاہکار ہمارے عشق میں گرفتار ہوگی، جب انہوں نے اپنی جوانی کے منہ زور گھوڑے کو لگام دیکر ہمارے لئے ایک روشن اور عمدہ مثال قائم کردی تو ہمارے لئے ان کا اسوۂ حسنہ راہ نجات ہونا چاہئے اور زندگی کے کسی بھی مرحلے پر اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو قرآن کریم کا یہ حکم ہمارے لئے مینارۂ نور ہونا چاہئے۔

"اور زنا کے قریب بھی نہ جانا کیونکہ وہ فحاشی ہے اور انتہائی بے راہ روی"

(الاسراء:۳۲)

سورہ مبارکہ بنی اسرائیل کی محولہ بالا آیت کا ترجمہ ایک مرتبہ پھر پڑھئے اور غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں نہیں فرمایا کہ "بدکاری مت کرو" یہ کیوں فرمایا کہ "زنا (بدکاری) کے قریب بھی نہ جانا" آپ پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ بدکاری کی طرف جانے والے تمام راستوں اور اسباب کو اسی معجزانہ بلیغ مفہوم میں بیان کیا جا سکتا تھا کہ ارتکاب زنا تو بڑی دور کی بات ہے اس کی طرف جانے والے راستوں سے بھی اپنی حفاظت کرنا کیونکہ یہی ایک مومن کی ذمہ داری ہے جس کا قرآن اور صاحب قرآن ﷺ اس سے مطالبہ کرتے ہیں۔

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

حرمت قمار (جوا)

راتوں رات امیر بننے کے شوق میں مبتلا ہو کر اپنی دنیا وعقبیٰ برباد کر دینے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہم اپنے معاشرے اور اردگرد کی آبادی میں دیکھتے رہتے ہیں، جو پہلے کوڑیوں کے محتاج تھے، اب کروڑوں میں کھیلنے لگے اور جو کروڑوں کے مالک تھے، اب وہ کوڑیوں کو ترسنے لگے، شاید یہ ایک ایسی تلخ حقیقت اور کڑوا سچ ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوگا کہ اس شوق میں کتنے گھر اجڑے، کتنی عزتیں سرعام نیلام ہوئیں اور کتنی عصمتوں کا جنازہ اٹھا، لیکن انسانی حرص وہوس کا کیا کیجئے جو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے انجام سے بے خبر کر کے اور خوابوں کی دنیا میں پہنچا کر اسکا بیڑہ غرق کئے بغیر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور انسان اس حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے

"السعید من وعظ بغیرہ"

"دوسرے کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرنے والا شخص نیک بخت ہوتا ہے"

عقلمند ہے وہ شخص جو پھسلن والے راستے پر دوسروں کو پھسلتا دیکھ کر اپنا راستہ تبدیل کر لے، کامیاب ہے وہ شخص جس کے دل سے مال ودولت کی محبت اور حرص وطمع کو کھینچ کر نکال دیا گیا ہو اور بڑا ہی بیوقوف ہے وہ شخص جو جان بوجھ کر کیلے کے چھلکے پر پاؤں رکھے اور گرنے کے بعد اپنی زبان کو اپنے مسلمان بھائی کی برائی سے گندگی میں ملوث کرے۔

☆......☆......☆......☆......☆

جاہلیت جدیدہ میں جسے "تہذیب جدید" کا لیبل اور نام دیکر بہت سے لوگ کسی خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں، جوا جتنا رائج ہو چکا ہے، جاہلیت قدیمہ میں بھی یہ کوئی اجنبی چیز نہ تھی، جس سے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہر زمانے میں اس کے دلدادہ افراد رہ چکے ہیں، لیکن امید ہے کہ یہ وہی افراد ہو سکتے ہیں جنہیں ملک وملت سے محبت کی بجائے اپنے ذاتی مفادات محبوب ہوں، جنہیں وطن کی مٹی کی بجائے اس کے سونا چاندی سے پیار ہو، اور جنہیں اپنے غریب بھائیوں سے کسی قسم کی ہمدردی کی بجائے ان سے نفرت ہو۔

ہماری اجتماعی اور انفرادی زندگی سے "احساس" رخصت ہو چکا ہے، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے تحت غریب، غریب سے غریب تر ہوتا جا رہا ہے اور امیر، امیر سے

امیز تر ہوتا جا رہا ہے، اگر ہم بڑھتی ہوئی نفرتوں، عداوتوں اور دشمنیوں پر قابو پا کر اپنے ملک کو امن و امان کا گہوارہ بنانے کا حقیقی اور سچا عزم رکھتے ہیں تو ہمیں اپنے اندر ''احساس'' پیدا کرنا ہوگا جو ہمیں جوئے جیسی لعنت سے بچا سکے کیونکہ قرآن کریم اسے ''رجس'' (ناپاک) اور شیطانی عمل قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو اس سے بچنے کی پرزور تاکید کرتا ہے اور سورہ مبارکہ مائدہ کی آیت نمبر ۹۰ میں کامیابی کا دارومدار جوئے سے اپنے آپ کو بچا لینے پر رکھتا ہے۔

اسی طرح قرآن کریم ہی ہمیں بتاتا ہے کہ شراب نوشی اور جوے کی لت میں مبتلا کر کے شیطان تمہیں آپس میں نفرت و دشمنی جیسی گھن آمیز چیزیں گھول کر پلا دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس لعنت میں مبتلا افراد کے درمیان ہمیشہ نفرت، بغض اور دشمنی کی خلیج حائل رہتی ہے اور وہ کبھی بھی ایکدوسرے کے قریب نہیں آپاتے، پھر ذکر الٰہی اور خاص طور پر نماز سے غفلت بھی اسی کا نتیجہ ہوتی ہے اس لئے اس وبال جان سے اپنا پیچھا چھڑانے ہی میں دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔

حرمت خنزیر

گو کہ انسان کے علاوہ دیگر حیوانات احکام شرعیہ کے مکلف نہیں اور نہ ہی انہیں اتنی عقل دی گئی ہے کہ وہ اچھے اور برے یا نیکی اور بدی میں امتیاز کر سکیں تاہم اتنی بات ماہرین حیوانات کے بیان سے ثابت شدہ ہے کہ جانور اپنے جذبات کی تسکین میں ہر طرح سے آزاد ہونے کے باوجود اپنی ماں پر غلط نگاہ کبھی نہیں ڈالتے لیکن ایک جانور ایسا ہے جو اس احترام کا بھی قائل نہیں اور دور حاضر کے متجددین کی طرح ''تازہ دودھ'' کا نظریہ رکھتا ہے، اس کی سوچ یہ ہے کہ ''تازہ دودھ'' جہاں سے بھی دستیاب ہو، انسان کا حق ہے اور اس کے لئے اسے اپنے گھر کی کھونٹی پر ''بھینس'' لا کر باندھنے کی بھی ضرورت نہیں، اس جانور کا نام ''خنزیر'' ہے جس کے بارے عوام میں یہ مشہور ہے ''گو کہ اس کی شرعی حیثیت تو کچھ نہیں تاہم اس کی کراہت کی ایک دلیل ضرور ہے'' کہ اس کا نام لینے سے زبان چالیس دن تک ناپاک رہتی ہے۔

قرآن کریم نے انتہائی وضاحت کے ساتھ ہماری رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا ہے

"اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃَ وَالدَّمَ وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِیۡرِ وَمَاۤ اُہِلَّ بِہٖ لِغَیۡرِ اللّٰہِ" (البقرۃ: ۱۷۳)

"اللہ تعالیٰ نے تم پر مردار جانور، خون، خنزیر کا گوشت (خاص طور پر) اور غیر اللہ کے نام پر دی جانے والی چیزیں حرام ہی تو کر دی ہیں"

ہو سکتا ہے کہ اس موقع پر کسی صاحب کے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ قرآن کریم میں تو صرف خنزیر کے گوشت کو حرام قرار دیا گیا ہے، اس سے خنزیر کا نجس العین یعنی مکمل طور پر ناپاک ہونا کیسے ثابت ہو گیا؟ تو اس کے لئے میں کوئی فلسفیانہ موشگافیاں اور علمی نکات بیان کرنے کی صلاحیت تو اپنے اندر نہیں پاتا کہ یہ اکابر اہل علم کا منصب ہے اور انہی کو زیب دیتا ہے، تاہم اتنی بات ضرور کہوں گا کہ آیت کے مندرجات پر غور کر کے دیکھا جائے تو اس میں ان چیزوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو ماکولات۔یعنی کھانے پینے کی چیزوں سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی حرمت کا حکم دیا گیا ہے ظاہر ہے کہ خنزیر کا بھی صرف گوشت ہی کھایا جا سکتا ہے جیسا کہ دوسرے جانوروں میں ہوتا ہے، اس مناسبت سے یہاں صرف گوشت کی حرمت بیان کی گئی ہے ورنہ اس کے جسم کا ایک ایک حصہ اور ایک ایک بال مکمل طور پر ناپاک ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ غیر مسلم ممالک تو رہے ایک طرف، مسلم ممالک میں بھی بڑی بڑی تقریبات اب خنزیر کے گوشت کے بغیر نامکمل رہنے لگی ہیں اور اس کا گوشت اس بے تکلفی سے استعمال کیا جانے لگا ہے جیسے ایک عام آدمی بکری کا گوشت کھانے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتا اور عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ خنزیر کا گوشت استعمال کرتے ہیں، منجانب اللہ ان میں بھی وہی بے حیائی، بے غیرتی اور درندگی پیدا ہو جاتی ہے جس کے سانچے میں خنزیر ڈھلا ہوا ہوتا ہے۔

یاد رکھئے! ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کے استعمال سے بھی رکیں اور اسے استعمال کرنے کو حرام بھی سمجھیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں ایک ذمہ دار مسلمان کا انعام مل سکے۔

اسی آیت کے ضمن میں ایک اور بات بھی عرض کرتا چلوں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات قطعاً پسند نہیں کہ پوری کائنات اور اس میں پائے جانے والے ذرے ذرے کو وجود بخشے اور اس کی نیاز

کسی اور کے نام پر دی جائے اور یہ ایک ایسی بات ہے جو ہر انسان کو با آسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔

ہمارے یہاں یہ ایک رواج بن چکا ہے کہ ہم نے اپنے صدقات و خیرات اور نذر و نیاز کو مخصوص افراد کے نام کر رکھا ہے، اگرچہ وہ افراد خود بھی ہمیں اس کام سے سختی کے ساتھ منع کر گئے ہوں، لیکن ہم نے تو اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دینی ہے اس لئے ہم وہی کریں گے جو ہمارا نفس اور شیطان ہمیں سمجھا دیں گے۔

دیکھئے! دنیا کا ایک عام سا اصول ہے کہ بیٹے کی پیدائش پر سب ہی خوش ہوتے ہیں، اس لئے کہ ان کے سامنے اپنا مستقبل اور بڑھاپا ہوتا ہے اور انہیں یہ امید ہوتی ہے کہ میرا بیٹا جوان ہو کر میرے بڑھاپے کا سہارا بنے گا، محنت مزدوری سے حاصل ہونے والی تنخواہ میرے ہاتھ پر لا کر رکھے گا اور گھر کا سارا نظام صحیح چلتا رہے گا اب اگر وہی بیٹا جسے بڑے چاؤ، محبت اور لاڈ پیار سے پالا گیا ہو، اس کے تعلیمی اخراجات برداشت کیے گئے ہوں، اور زندگی کے کسی بھی مرحلے پر اسے تنہا نہ چھوڑا گیا ہو، جب کچھ کرنے کے قابل ہو جائے، چار پیسے کمانے لگے اور اس کے ہاتھ میں کچھ آنے لگے تو وہ اپنی تنخواہ اٹھا کر کسی دوسرے غیر متعلقہ شخص کو دے آئے، آپ خود ایمانداری کے ساتھ بتائیے! اس کے والدین کو کتنا دکھ ہوگا؟ انہیں کتنا صدمہ ہوگا اور وہ کس قدر دل گیر ہوں گے کہ کیا ہم نے تجھے اس دن کی خاطر پال پوس کر جوان کیا تھا؟

عجیب بات ہے کہ ہم بوڑھے والدین کو تنخواہ کا حقدار تو سمجھتے ہیں لیکن پروردگار عالم کو اپنی بدنی و مالی عبادات کا مرکز قرار دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے، یہ کس منطق ہے کہ اس موقع پر خاموش ہو جانے والے والدین کو صبر و تحمل کا پیکر پوری دنیا قرار دیتی ہے لیکن وہ اللہ جو اس نوجوان جیسے سینکڑوں نافرمانوں کو نہ صرف یہ کہ برداشت کر رہا ہے بلکہ انہیں دوسروں سے بڑھ کر عطا کر رہا ہے، اس کے حلم و بردباری میں ہمیں شکوک و شبہات کے اندھیرے گھیر لیتے ہیں۔

یاد رکھئے! غیر اللہ کے نام پر چڑھائی جانے والی ہر نیاز، خواہ کسی بھی شکل میں ہو، قرآن کریم کی اس نص قطعی کی روشنی میں حرام ہے، اگر ہمیں کسی بزرگ سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار ہی کرنا ہو تو اس کا یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ اس نیاز کو اللہ کے نام پر چڑھا کر یہ دعا کی جائے کہ پروردگار! یہ نیاز میں آپ کے نام پر دے چکا، اس کا جو ثواب آپ نے

منتخب فرما رکھا ہے، وہ ان بزرگوں کی خدمت میں تحفہ کے طور پر پیش فرما دے، اللہ کی نافرمانی سے بھی بچ جائیں گے اور بزرگوں کی روحیں بھی خوش ہو جائیں گی۔

تبصرہ

یہ ہے اہل ایمان کی وہ دوسری اہم ترین ذمہ داری جس کا قرآن کریم اپنے پیروکاروں اور ایمان اپنے دعویٰ داروں سے مطالبہ کرتا ہے اور انہیں اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ اللہ کے حرام کیے ہوئے کو حرام اور اللہ کے حلال کیے ہوئے کو حلال سمجھنا اور برتنا ہی ایک مومن کی شان ہے، اگر حلال و حرام کی تمیز ختم کر دی جائے تو انسان کو دوسرے حیوانات سے پھر کیا چیز جدا کر سکے گی۔

آخر میں اس مضمون سے متعلق ایک اہم ترین حدیث صحیح بخاری سے پیش کر کے بات کو ختم کیا جا رہا ہے۔

"عن ابی ھریرۃ عن النبی ﷺ قال: یاتی علی الناس زمان لا یبالی المرء ما اخذ منه، امن الحلال ام من الحرام؟" (البخاری:۲۰۵۹)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جس میں انسان کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں رہے گی کہ اس نے حلال چیز اختیار کی ہے یا حرام؟"

☆......☆......☆......☆......☆

تیسری ذمہ داری

اوامر پر عمل اور نواہی سے اجتناب

یہ ایک ناقابل انکار وتردید حقیقت ہے کہ ہر چیز کو استعمال کرنے کا ایک مخصوص طریقہ ہوتا ہے جو ہر چیز پر آزمایا جا سکتا ہے اور نہ ہی ہمیشہ ایسا کرنے سے ایک جیسا نتیجہ حاصل ہونے کی توقع کرنی چاہئے دور حاضر کی جدید ایجادات اس کی بہترین مثالیں ہیں، جنہیں موجد کمپنیوں کی ہدایات کے مطابق استعمال کرنا ہر انسان ضروری سمجھتا ہے اور اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ کسی دوسرے طریقے سے اسے استعمال کرنے میں نقصان ہو سکتا ہے۔

اسی طرح ''زندگی'' جو کہ ایک عظیم نعمت ہے، کا موجد ہم سب کا پروردگار اللہ ہے، اگر ہم نے اس کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل اور اس کی منع کی ہوئی باتوں سے رک کر اس زندگی کا سفر طے کر لیا تو یقیناً ہم نے اس کا حق ادا کر دیا، بصورت دیگر خرابی (سزا) کے ذمہ دار ہم خود ہوں گے، اللہ یا کسی اور کو اس کا دوش دینا سراسر انصاف کا خون ہوگا۔

ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے تو زندگی گذارنے کا ضابطہ، طریقہ اور اصول بھی اسی کے پاس سے آنا چاہئے اور ہر اس شخص کو جسے تخلیقی مراحل سے گذارنے کے بعد دنیا میں بھیجا گیا ہو، ان اصولوں کی پاسداری اور پابندی کرنا چاہئے، شاید یہی وہ نکتہ تھا جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے انسانِ اول کو ان الفاظ میں متوجہ کیا تھا

''فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ'' (البقرہ:۳۸)

''جب تمہارے پاس میری طرف سے کوئی بھی ہدایت آئے، جو لوگ اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے''

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ زندگی گذارنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو تو دنیا میں ''نازل'' فرمایا ہی تھا، اس کی ہدایت کے لئے بھی آسمانی تعلیمات کو نازل فرماتا رہا

تاکہ انسان اپنے رب کی مرضی پہچان کر اس کے موافق زندگی گذارے اور واپس اپنے وطن مالوف (جنت) کو لوٹ جائے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ان آسمانی ہدایات کو دو حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اوامر: وہ باتیں جنہیں سرانجام دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

۲۔ نواہی: وہ باتیں جن سے رکنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

ذیل میں ان اوامر و نواہی کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ عمل کی راہ واضح اور آسان ہو سکے۔

نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ

بنیادی طور پر انسان کو "جسم اور مال" کی صورت میں دو بہت بڑی نعمتوں سے سرفراز کیا گیا ہے اور یہ تو قرآن کریم کا فیصلہ ہے کہ شکر کرنے سے نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے، ان نعمتوں کا شکر عنوان میں مذکور چاروں چیزوں سے بطریق احسن ادا ہو جاتا ہے چنانچہ نماز پڑھ کر انسان اپنے بدن کا شکر ادا کرتا ہے اور اس کے لئے اپنے پورے جسم کو متحرک کرتا ہے۔

نماز کی نیت کر کے اپنے قلب و ذہن، تکبیر بلند کر کے اپنی زبان، ہاتھ باندھ کر اپنے ہاتھ، کھڑے ہو کر اپنے پاؤں، رکوع میں جھک کر اپنی پشت، سجدے میں گر کر اپنی پیشانی اور ناک، تشہد میں بیٹھ کر اپنی رانوں اور گھٹنوں، درود شریف پڑھ کر اپنی عقیدت، دعا کر کے اپنی عاجزی اور سلام پھیر کر اپنے سر کی حرکت کا شکر ادا کرنے کا موقع ملتا ہے، کان سے امام کی قراءت سن کر اور آنکھ سے جائے سجدہ پر نظریں جما کر ان کا شکر ادا کرنے کی توفیق ہوتی ہے۔

جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے جسمانی اعضاء ان لوگوں کی نسبت زیادہ کام کرتے ہیں جو ادائے نماز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور نہ ہی اس کا خیال ان کے ذہن میں آتا ہے، پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر کوئی احسان مند اپنے محسن کی توجہات و احسانات کا معترف ہو تو اس پر احسان کرنے کو بھی دل چاہتا ہے، بصورت دیگر اسے "احسان فراموش" یا زیادہ بے باکانہ الفاظ میں "نمک حرام" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

نماز کے ذریعے جب انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی طرف سے "جسم" کی صورت میں ملنے والے عطیہ پر دلی عقیدت اور قلبی جذبات و احساسات کے ساتھ نذرانۂ

عقیدت اور ہدیہ محبت پیش کرتا ہے تو پروردگار عالم بھی خوش ہو کر اسے ''رضوان و غفران'' کی دولت سے سرفراز فرما دیتے ہیں اور اس جذبہ تشکر پر اس کی نعمتوں میں اضافہ کا فیصلہ فرما لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ نعمتوں میں اضافہ ہونے سے مصائب میں کمی ہونا فطرت کے عین مطابق ہے اس لئے اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

خارجی اور بیرونی اثرات کو ایک طرف رکھ کر اگر یہ فیصلہ کیا جائے کہ مال و دولت اور بینک بیلنس کا ہونا فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں ہے تو شاید اس فیصلے سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا کیونکہ اسی کے ذریعے کاروبار زندگی چل رہا ہے، نظام حیات اسی سے وابستہ کیا گیا ہے اور جسمانی ضروریات کی تکمیل اس کے بغیر نہیں ہوتی۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

شریعت کی بہت سی خوبیوں میں ایک اہم ترین خوبی'' جس کی طرف یہ ناکارہ اپنے مخاطبین کو متوجہ کرنا چاہتا ہے'' یہ ہے کہ انسانی فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کے بھرپور اور اہم مواقع فراہم کیے گئے ہیں، انسان اگر اپنی قوت عشقیہ کو بروئے کار لانا چاہتا ہے اور اس کے تقاضے اسے شدت سے محسوس ہوتے ہیں تو اس کے لئے حرمین شریفین میں بہت سے مواقع رکھ دیئے گئے ہیں۔

کسی کی محبوبہ سیاہ رنگ میں ملبوس ہو کر قیامت ڈھاتی ہے اور کسی کی منظور نظر دوسرے جاذب نظر رنگوں میں لپٹ کر اپنے حسن کے جلوے دکھاتی ہے، بلاتشبیہ خانہ کعبہ کا سیاہ ریشمی غلاف اور روضہ رسول ﷺ کا سبز گنبد اس کے جذبات کی تسکین کے لئے موجود ہے، اگر اسے اپنے محبوب کے گھر کے چکر لگانا پسند ہوں تو اس کے لئے طواف میں تسکین رکھ دی گئی ہے، اگر وہ دوڑ کر اپنے محبوب کو پانا چاہتا ہو تو سعی میں اس کی خواہش کی تکمیل کی گئی ہے، اگر وہ اپنے محبوب کی یاد میں بے قرار ہو کر اپنے سر کو بالوں سے آزاد کرنا چاہتا ہو تو اس کے لئے ''حلق'' کی صورت میں راستہ موجود ہے اگر وہ دربدر کی ٹھوکریں کھا کر اپنے محبوب کا وصال حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے عرفات، مزدلفہ اور منیٰ کے صحراء متعین کر دیئے گئے ہیں، اگر وہ مال و دولت نچھاور کر کے اپنے محبوب کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے

زکوٰۃ کی صورت میں ایک وظیفہ مقرر کر دیا گیا ہے، اگر وہ خاموش رہ کر اور زندگی کی آسائشوں سے منہ موڑ کر اپنے محبوب کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے تو روزہ کے ذریعے وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کر سکتا ہے، اگر وہ اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے تو قربانی کو اس کا نعم البدل قرار دیا گیا ہے، اگر وہ اپنے گھربار کو چھوڑ کر صرف دو کپڑوں میں زندگی گذار کر اپنے محبوب کی رفاقت حاصل کرنا چاہتا ہے تو احرام کی دو چادریں اس مقصد کو بطور خاص ادا کرتی ہیں، اگر وہ اپنے محبوب کا نام پوری دنیا میں گونجتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے تو تلبیہ اسی مقصد کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے، اگر وہ اپنے محبوب کی چوکھٹ پر حاضری دینا چاہتا ہے تو اس کے لئے ملتزم اس کی راہ تک رہا ہے، اگر وہ اپنے محبوب کے گھر کے پرنالے سے اپنے آپ کو تر کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے میزاب رحمت لگا دیا گیا ہے، اگر وہ اپنے محبوب کے کپڑوں کو چھو کر اپنے جذبات کو تسکین دینا چاہتا ہے تو خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر وہ اپنی خواہش کی تکمیل کر سکتا ہے، اگر وہ اپنے محبوب کے ہاتھ کو بوسہ دینا چاہتا ہے تو حجر اسود کو بوسہ دیکر وہ اپنا مقصد حاصل کر سکتا ہے اگر وہ اپنے محبوب کے گھر میں داخل ہو کر ہی خوش ہو سکتا ہے تو اس مقصد کے لئے حطیم کو خانہ کعبہ کی موجودہ تعمیر سے اسی لئے خارج کر دیا گیا کہ وہ اپنی اس خواہش کی بھی تکمیل کر لے۔

اب جس شریعت نے اتنی باریکی کے ساتھ " جس کا ایک مختصر سا نمونہ آپ نے ابھی ملاحظہ فرمایا" اگر نماز کے ساتھ ساتھ حج، زکوٰۃ اور روزہ کا بھی حکم دیا ہے تو کیا ان میں انسانی اور فطری تقاضوں کی تکمیل کا بھرپور سامان موجود ہوگا یا نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو ہم اس شکوہ میں حد سے آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ خواہشات اور قوت عشق کا منہ زور گھوڑا قابو میں نہیں آتا اور اس کی تکمیل کے لئے کوئی دوسرا راستہ بھائی نہیں دیتا، اس لئے ہم مجبور ہیں۔

اسی نعم البدل کا تذکرہ ذیل کی مختلف آیات میں کیا گیا ہے۔

"وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ" (البقرہ: ۴۳)

"نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو"

روزہ کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" (البقرہ:۱۸۳)

"اے اہل ایمان! تم پر بھی اسی طرح روزے فرض قرار دیئے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تا کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے"

اور حج کی فرضیت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

"وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا"

(آل عمران:۹۷)

"صرف رضاء الٰہی کے حصول کے لئے لوگوں پر حج کو فرض قرار دیا گیا ہے بشرطیکہ وہاں جانے کی استطاعت بھی ہو"

ان آیات طیبہ کو سامنے رکھ کر ایک لمحے کے لئے اپنی ان خواہشات کا جائزہ لیجئے جو کسی بھی انسانی ذہن میں آسکتی ہیں، پھر شریعت کی تعلیمات پر غور کریں، آپ اس بات سے اتفاق کرنے پر اپنے آپکو مجبور پائیں گے کہ انسانی فطری تقاضوں کا خیال اس سے بہتر انداز میں تو بہت دور کی بات ہے، اس کے قریب بھی کوئی دھرم، مذہب اور ضابطہ حیات نہیں رکھ سکا۔

☆......☆......☆......☆......☆

عدل وانصاف

قانون بنانا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا اسے نافذ کرنا مشکل ہوتا ہے اسی لئے قانون دان اور قانون ساز میں جو فرق ہوتا ہے وہی قانون نافذ کرنے والے میں ہوتا ہے، اگر قاضی، جج اور جسٹس کسی بھی قانونی فیصلے میں اپنے اور بیگانے کا امتیاز رکھے بغیر حکم جاری کرتا ہے تو دنیا ہمیشہ اسے اچھے نام اور تعارف کے ساتھ یاد رکھتی ہے اور اگر اس کی نظر میں اس کے متعلقین دوسروں کی نسبت زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، غریب آدمی کی اس کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں ہوتی اور وہ اپنے فیصلوں میں اپنے اور بیگانے کا فرق روا رکھتا ہے تو کوئی چیز اسی بھی دل سے اس کی عزت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

جسمانی یا روحانی ڈاکٹر اگر ہر آنے والے مریض کے ساتھ خوش اسلوبی سے پیش آئے تو اس کے ہاتھ میں شفا، کام میں برکت اور بول میں اثر ہوتا ہے اور لوگ ہمیشہ اسے اچھائی کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور اگر امیر و غریب، حاکم اور محکوم، آقا اور ملازم کا تصور اس کے پیش نظر رہنے لگے تو یقیناً وہ اپنے مریضوں کے ساتھ ظلم کرتا ہے۔

کسی سرکاری، نیم سرکاری یا غیر سرکاری ادارے کا افسر اور ڈائریکٹر، اہلیت رکھنے والے ذمہ دار افراد کو ان کی پیشہ ورانہ خدمات پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انہیں ترقی دیتا ہے تو سب ہی خوش ہوتے ہیں اور اگر کسی کی سفارش پر اہلیت نہ ہونے کے باوجود یا اپنے اور بیگانے کے تصور کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی کو ترقی دیتا ہے تو اس کے اپنے ماتحت ہی اسے پیٹھ پیچھے گالیاں دیتے ہیں۔

اگر ہم اس تفریق و امتیاز کو بالائے طاق رکھ کر حقدار کو اس کا حق دیدیں تو عدل و انصاف کا تقاضا بھی پورا ہو جائے گا، ظلم سے بچاؤ بھی ہو جائے گا، اللہ کا حکم بھی پورا ہو جائے اور حقدار کے دل سے نکلنے والی دعاؤں کا حصہ بھی مل جائیگا۔

اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

"اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ" (النحل:۹۰)

"بیشک اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتے ہیں"

والدین کے ساتھ حسن سلوک

دنیا میں انسان پر اللہ کی جن ان گنت نعمتوں کی برسات ہر وقت برستی رہتی ہے، ان میں سے بعض نعمتیں ایسی بھی ہیں جن کا نعم البدل پوری کائنات میں تلاش کرنا لاحاصل اور بے فائدہ ہے، جن کی محبت بے لوث ہوتی ہے، جنہیں ہماری ترقی سے فطری طور پر خوشی ہوتی ہے، ہمارا غم انہیں اپنی طبیعت پر بوجھ محسوس ہوتا ہے اور ہماری خاطر اپنی جوانی، آرام و راحت اور خوشیوں کو پس پشت ڈال دینا انہیں اپنی ذمہ داری محسوس ہوتی ہے، یہ "والدین" کی نعمت ہے، جس کے بارے شیخ سعدیؒ نے بجا فرمایا ہے

قدر نعمت بعد از زوال

انسان سے جب کوئی نعمت خاص طور پر والدین کا سایہ چھن جاتا ہے، اس وقت اسے

اس کی قدر آتی ہے، اس سے پہلے وہ اس کی صحیح قدردانی کی طرف بہت کم متوجہ ہو پاتا ہے، لیکن چھن جانے کے بعد اس کی قدر آئی تو کیا ہوا؟ اس سے کیا نتیجہ برآمد ہو سکے گا؟ اور اس کا کیا فائدہ ہو سکے گا؟

☆......☆......☆......☆......☆

جوانی کے نشے میں مست ہو کر انسان بعض اوقات والدین سے لڑ بھی پڑتا ہے، بعض بدنصیب انہیں گالیاں دینے سے بھی نہیں چوکتے اور بعض سخت دل تو ان پر ہاتھ اٹھانے میں بھی کوئی جھجک اور شرم محسوس نہیں کرتے اور بعد میں ان کے جنازے پر آنکھوں سے آنسو بہاتے دکھائی دیتے ہیں، دل گرفتہ اور پریشان محسوس ہوتے ہیں، رہ رہ کر انہیں اپنی زیادتیاں اور ان کی آہیں یاد آتی ہیں، وہ تڑپتے اور کڑھتے ہیں لیکن کچھ کر نہیں سکتے۔

آیئے! آپکو ایک ایسا طریقہ بتا دوں کہ اگر والدین کی زندگی میں ان کی نافرمانی ہوگئی ہو، ان کے مقام ومرتبہ میں کوتاہی ہوگئی ہو اور انہیں ان کا جائز مقام نہ دیا جا سکا ہو تو اس کی تلافی کیسے ہوگی؟ سب سے پہلے تو دو رکعت نمازِ توبہ پڑھ کر صدقِ دل سے اپنے افعال پر ندامت کا اظہار کر کے توبہ کریں، پھر اپنے والدین کی بخشش اور بلندیٔ درجات کے لئے کثرت سے دعائیں کریں اور ان کی طرف سے صدقہ وخیرات کریں، اور جب بھی موقع ملے، خود یا کسی کے ذریعے قرآن کریم پڑھوا کر ان کے لئے ایصالِ ثواب کریں، ان کے متعلقین سے اچھا سلوک کریں، خاص طور پر والد کی طرف سے چچا کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئیں کیونکہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔

"عم الرجل صنو ابیه"

"انسان کا چچا بھی باپ ہی کے ہم مرتبہ ہوتا ہے"

اور والدہ کی طرف سے خالہ کے ساتھ حسنِ سلوک کریں کیونکہ جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

"الخالة بمنزلة الأم"

"خالہ، ماں ہی کے مرتبہ میں ہوتی ہے"

اس کے ساتھ ساتھ مؤلف ایک درخواست ان والدین سے بھی کرنا ضروری سمجھتا

ہے جنھوں نے "میاں بیوی" کے باہمی جھگڑوں اور سر پھٹول کے ذریعے اپنے گھر کو جہنم کا نمونہ بنا رکھا ہو، بات بات پر گالیاں دینا ان کی گفتگو کا لازمی حصہ بن چکا ہو اور گھر میں بیٹھ کر گھریلو مسائل میں اپنی آرا، کا بیجا اظہار کرنا ان کا فرض منصبی بن چکا ہو، خدا کے لئے وہ اپنی اولاد کے حق میں خود زیاں نہ دیں، اس لئے کہ اولاد بھی بہر حال انسان ہوتی ہے، اس کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے، اس میں بھی سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس میں بھی ردعمل کا جذبہ ہوتا ہے، جب اسے حد سے زیادہ تنگ کیا جائے تو پھر ایک نہ ایک دن تو اس آتش فشاں نے پھٹنا ہی ہوتا ہے۔

ہم اس تمام دورانیے کو فراموش کر دیتے ہیں جو اس پر بیتا ہوتا ہے اور اس کے نتیجے کو اچھالنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں، لمحے کے کروڑویں حصے میں ہم یہ فتویٰ لگانے کے لئے موجود ہوتے ہیں کہ ہماری اولاد تو بہت گستاخ ہے، بہت نافرمان ہے، ایسی اولاد تو اللہ کسی کو بھی نہ دے، ایسی اولاد ہونے سے تو نہ ہونا ہی بہتر ہے وغیرہ، اور یہ وہ جملے ہیں جو ہمیں روزانہ اپنے ارد گرد سے سننے کو ملتے رہتے ہیں۔

پھر چونکہ یہ "فتویٰ" والدین کی طرف سے لگایا جاتا ہے اس لئے لوگ بھی اولاد کو نفرت آمیز نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں، اپنی محفلوں کو ان کی "گستاخی" کے تذکرے سے آباد کرنے لگتے ہیں، والدین کو مظلوم اور اولاد کو ظالم سمجھنے لگتے ہیں جبکہ حقائق اکثر اس کے برخلاف ہوتے ہیں، اس لئے اولاد کو ہی مکمل طور پر قصور وار ٹھہرانا سراسر ناانصافی ہے، تاہم اولاد کو اپنی طرف سے ادائے حقوق و فرائض کی مکمل کوشش کرنی چاہئے اور اس بات کا احساس کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اکثر مقامات پر اپنی عبادت کا حکم دیکر سب سے پہلے جس چیز کی اہمیت کا احساس دلایا ہے وہ والدین کے ساتھ حسن سلوک ہی ہے، جا بجا والدہ کی اس تکلیف و مشقت کا تذکرہ کیا گیا ہے جس سے وہ گذر کر ہی اپنے شوہر کی نسل کو باقی رکھ پاتی ہے، مختلف مواقع پر ان کے حقوق کا تعین کیا گیا ہے اور ان کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے چنانچہ کہیں ارشاد ہے۔

"وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّ
وَضَعَتْهُ كُرْهًا" (الاحقاف: ۱۵)

"ہم نے انسان کو اس کے والدین سے متعلق حسن سلوک کی وصیت کر رکھی ہے، کہ اسے اس کی والدہ نے بڑی تکلیف میں اپنے بطن کے اندر اٹھائے رکھا اور بڑی تکلیف دہ حالت میں اسے جنم دیا ہے"

اور کہیں فرمایا گیا ہے۔

"وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا اِمَّا یَبۡلُغَنَّ عِنۡدَکَ الۡکِبَرَ اَحَدُہُمَاۤ اَوۡ کِلٰہُمَا فَلَا تَقُلۡ لَّہُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنۡہَرۡہُمَا وَقُلۡ لَّہُمَا قَوۡلًا کَرِیۡمًا وَاخۡفِضۡ لَہُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَۃِ وَقُلۡ رَّبِّ ارۡحَمۡہُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیۡ صَغِیۡرًا" (الاسراء:۲۳،۲۴)

"آپ کا رب یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ تم لوگ اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کرو گے اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ گے، اگر تمہارے سامنے ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کی منزل کو پہنچ جائیں تو انہیں "اف" بھی نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا بلکہ ان سے نرمی کی بات کہنا اور نیاز مندی سے ان کے سامنے اپنی عاجزی کے کندھے جھکا دینا اور یہ دعا کرنا کہ اے میرے پروردگار! ان پر اپنا رحم فرما کہ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا پوسا تھا"

یوں تو اس مضمون کی آیات بہت زیادہ ہیں لیکن طوالت کے اندیشے سے انہیں موخر کر کے ایک حدیث پر اس عنوان کو ختم کیا جاتا ہے جو والدین کی حیثیت متعین کرنے میں ایک رہنما اصول کا درجہ رکھتی ہے، یعنی حضور ﷺ کا یہ مشہور عالم ارشاد

"هما جنتك و نارك"

"والدین جنت بھی ہیں اور جہنم بھی"

اس مختصر جملے میں معانی کا کتنا بڑا سمندر موجزن ہے، راقم الحروف کی عقل نارسا اس کی حقیقت کا صحیح ادراک کر سکتی ہے اور نہ ہی یہ مختصر صفحات اس کے متحمل ہو سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس نعمت کی قدر کرنے کی توفیق ہم سب کو عطا فرمائے۔ آمین

یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں کی خبر گیری

جس کے سر سے والدین کا سایہ اٹھ جائے، دنیا اسے "یتیم" کہتی تو ہے لیکن اس کے اپنے ہی اسے یتیم سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، بھائی بہن کے رخصت ہوتے ہی یتیم بھتیجوں اور بھانجوں کو جو ابھی کچھ کر سکنے کے قابل ہی نہیں ہوتے انتہائی بے دردی، بے رحمی اور سفاکی وخود غرضی کے سفلی جذبات سے مجبور ہو کر دھکے دیکر نکال دیا جاتا ہے، ان کے والد کی جائیداد و مال دولت پر ان ہی کا حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جاتا ہے، ان کے سر سے چھت اور پاؤں سے زمین چھین لی جاتی ہے، انہیں اپنے ہی گھر میں اجنبی بنا دیا جاتا ہے، انہیں ان کے جائز حقوق دینا تو بڑی دور کی بات، گنڈیری کے چھلکے سے بھی زیادہ حقیر سمجھا جاتا ہے۔

ایسے لوگ اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ کل کو انہوں نے بھی بہر حال دنیا سے جانا ہے، اگر ان کی اولاد سے ایسا سلوک کیا جائے اور انہیں بد سلوکی کرنے والوں پر قابو بھی دیدیا جائے تو کیا وہ جوش انتقام میں اپنے جذبات پر قابو رکھ سکیں گے؟ کیا اپنی اولاد کے ساتھ یہ سلوک ہوتے ہوئے دیکھ کر انہیں طبعی طور پر رنج وغم محسوس نہیں ہوگا؟ کیا دنیا سے مکافات عمل کا اصول ختم ہو چکا ہے؟ ان سوالات کے جواب سوچتے ہوئے ذیل کی آیت ملاحظہ فرمائیے۔

> "لوگوں کو اس وقت سے ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمزور بچے چھوڑ جائیں تو انہیں ان کے بارے کتنا اندیشہ ہوگا، بصرف اللہ ہی سے ڈرنا چاہئے اور سیدھی بات کہنی چاہیے"
>
> (آل عمران:۹)

یتیم کا مال ہضم کرنے کے بعد تو اب ڈکار آنا بھی بند ہو گئی ہے کہ اس سے پیٹ ہی نہیں بھرتا اور بے چارہ یتیم بچہ ایک وقت کی روٹی کو بھی ترس رہا ہوتا ہے، اسے اپنی بھوک مٹانے کے لئے دست سوال دراز کرنا پڑتا ہے اور اپنی عزت نفس کو داؤ پر لگانا اسکی مجبوری بن جاتی ہے، ذیل کی آیت بھی پڑھئے۔

> "بیشک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، درحقیقت وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرتے ہیں اور عنقریب جہنم ہی میں وہ پہنچ بھی

جائیں گے" (آل عمران:۱۰)

ہماری معاشرتی صورت حال کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ اگر وراثت کی تقسیم کے موقع پر کوئی مالی طور پر کمزور پوزیشن والا رشتہ دار آجائے تو اس پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے، اسے برا بھلا کہا جاتا ہے اور اسے طعنے دے دے کر ذلیل کیا جاتا ہے کہ تو نے بھی آج ہی آنا تھا، اس موقع پر ہمارے کان میں کوئی یہ کیوں نہیں پھونک دیتا؟

"جب تقسیم وراثت کے موقع پر دیگر قریبی رشتہ دار، یتیم اور مسکین آجائیں تو انہیں بھی اس میں سے کچھ دیدو اور ان سے نرمی کے ساتھ بات کرو" (آل عمران:۸)

راقم الحروف کو اس بات پر اعتماد کامل ہے کہ اگر انسان کو تنگی رزق کی شکایت ہو، لوگوں کی نگاہوں میں عزت و احترام کی جھلک نظر نہ آنے کا شکوہ ہو تو یقیناً اس کی ایک بہت بڑی وجہ یتیم کے ساتھ ہونے والی وہ بدسلوکی بھی ہوتی ہے جو اس کے دل سے ایک درد بھری آہ نکلوا دیتی ہے اور وہ ایک آہ ہی انکی تباہی و بربادی کے لئے کافی سے زیادہ ہو جاتی ہے اس لئے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

"جب اللہ تعالیٰ انسان کو اس کا رزق تنگ کر کے آزماتے ہیں تو انسان کہتا ہے کہ میرے رب نے تو مجھے رسوا کر کے رکھ دیا، حالانکہ ایسی بات ہرگز نہیں، اصل میں تم خود ہی یتیم کا اکرام نہیں کرتے، ایکدوسرے کو مساکین کے کھانے کے سلسلے میں ترغیب نہیں دیتے، مال وراثت سارا کا سارا سمیٹ کر ہڑپ کر جاتے ہو اور مال سے خوب جی بھر کر محبت کرتے ہو" (الفجر:۱۶ تا ۲۰)

دلوں میں پیدا ہونے والی سختی کا علاج یتیم کے سر کے بالوں میں رکھا گیا ہے، ذہن میں بھر جانے والے خناس کا علاج مسکنت میں رکھ کر یہ دعا سکھائی گئی ہے۔

"اللهم احيني مسكينا و امتني مسكينا و احشرني في زمرة المساكين"

بیواؤں کی خبر گیری میں قلب شقی کے لئے ہمدردی و نصیحت کے جذبات ابھارنے کا

سلیقہ ودیعت کر دیا گیا ہے اور جابجا یہ حکم دیا گیا ہے۔

"ہم نے بنی اسرائیل سے بھی یہ وعدہ لیا تھا کہ اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو گے، والدین، قریبی رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ گے اور لوگوں سے اچھے انداز میں گفتگو کرو گے" (البقرہ: ۸۳)

میں اپنے کسی مخاطب سے یہ تو نہیں کہتا کہ اپنی جیب کاٹ کر ان کی جیب اور اپنا پیٹ کاٹ کر ان کا پیٹ بھر دیجئے البتہ اتنی بات ضرور کہوں گا کہ انہیں ان کا جائز حق ادا کر دیجئے اور ان کی بات توجہ کے کان سے سن لیجئے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قدردانی فرمائیں گے کہ وہ تو ہیں ہی قدردان، اصل ناقدری تو انسان کرتا ہے۔

پڑوسیوں کے ساتھ عمدہ تعلقات

زندگی میں ہمیں بہت سے "پڑوسیوں" سے واسطہ پڑتا ہے تاہم ان میں سے ہر ایک کو ہم اچھے الفاظ سے یاد کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے اور نہ ہی ان کا "قابل قدر رویہ" اس بات کی اجازت دیتا ہے، بعض پڑوسی صرف ایک "مجلس" کی حد تک محدود ہوتے ہیں، بعض پڑوسی ایک "کلاس" کی حد تک محدود ہوتے ہیں، بعض پڑوسی "محلہ داری" کی حیثیت میں ہوتے ہیں اور بعض پڑوسی گھر کی دیوار کے ساتھ متصل یا مقابل آباد ہوتے ہیں۔

اس فہرست کے بعض پڑوسی کبھی ہم سے جدا ہو کر چلے جاتے ہیں اور کبھی ہم ان سے جدا ہو جاتے ہیں، پھر بعض اوقات برسوں تک اور بعض اوقات پوری زندگی میں ایک دوسرے سے دوبارہ ملاقات نہیں ہو پاتی لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ شریعت کی باریک بینی ہر "پڑوسی" کے ساتھ" خواہ اس کے ساتھ چند لمحے گذاریں یا زندگی کا ایک معتدبہ حصہ" حسن سلوک کی تربیت دیتی ہے اور اپنے ہر پیروکار کو اس بات کی تلقین کرتی ہے کہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آنا اسلام کی معاشرتی تعلیم کا حصہ ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

"اللہ کی عبادت کیا کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ، نیز قریبی رشتہ داروں، یتیموں،

اور ڈاکوؤں کی سرپرستی کا سہرا اس کے سر پر سجا ہو یا لوگوں کی امانتوں میں خیانت کرنے کا بدنما دھبہ اس کے چہرے پر لگا ہو، یتیموں کا مال اس کے ہاتھوں بے دردی سے لٹ رہا ہو یا قرض خواہ اس کے پیچھے ذلیل وخوار ہو رہے ہوں۔

جبکہ حقیقی کامیاب زندگی اس شخص کی ہوتی ہے جسے اپنے پاس آنے والی ایک ایک پائی کا حساب کتاب مستحضر ہو، رشوت، سود اور جوے کو وہ گھناؤنا، قابل نفرت اور ایک صحت مند معاشرے کے لئے زہر قاتل اور ناقابل معافی جرم سمجھتا ہو، اس کا ذریعہ معاش کمزور، غریب، یتیم، مسکین، بیوہ اور ضعیف لوگوں کی دعائیں ہوں، امانت کا سچا، وعدہ کا سچا اور قرض کا پکا ہو۔

تصویر کے یہ دو رخ ہم نے آپکے سامنے پیش کر دیئے ہیں، جس رخ پر چلنا ہماری طبیعت کے لئے آسان ہو، اسی کے مطابق نتیجہ اور انجام کی بھی امید رکھنی چاہیے کیونکہ روز جزاء مکافات عمل کا دوسرا نام ہے، گندم بونے والا جس طرح چاول اور چینی حاصل کرنے کی تمنا نہیں کرتا، اسی طرح بدی کے راستے پر بگٹٹ دوڑنے والے گھوڑے کو بھی خیر کی تمنا کرنا بیکار ہے، مالک اپنا فضل کر دے تو ہم سب ہی اس کے محتاج ہیں۔

بہر حال! بات دور نکل گئی، عرض یہ کی جارہی تھی کہ ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ اگر کسی شخص نے اسے امانت دار سمجھ کر کوئی امانت اس کے سپرد کی ہو تو اس کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائے، اس میں خیانت سے اپنے آپکو بچائے اور وقت آنے پر وہ چیز بے چوں و چرا مالک کے حوالے کر دے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی کرتا چلوں کہ امانت سے مراد صرف وہ مال و دولت یا قیمتی دھات ہرگز نہیں جو کسی کے پاس رکھوائی جائے بلکہ اس سے مراد ہر وہ ذمہ داری ہے جس کی ادائیگی پر کسی شخص کو مامور کیا جائے اور اسے اس ذمہ داری کے بارے جواب دہ سمجھا جائے چنانچہ استاذ بھی امین ہے اور ادارہ کا سربراہ بھی، ملازم بھی امین ہے اور ڈائریکٹر بھی، حاکم بھی امین ہے اور محکوم بھی، اور سب ہی کو حکم دیا گیا ہے۔

"اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا" (النساء:۵۸)

"بیشک اللہ تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کو ادا کر دیا کرو"

کسی بھی نوعیت کی امانت میں خیانت کرنے سے سختی کے ساتھ ممانعت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْا اَمٰنٰتِکُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" (الانفال:۲۷)

"اے اہل ایمان! اللہ ورسول سے خیانت نہ کرو، نیز اپنی امانتوں میں بھی جان بوجھ کر خیانت نہ کرو"

اگر آپ اس آیت کے مفہوم پر غور فرمائیں تو اس تعریف کی تہہ تک پہنچنا بھی آسان ہو جائے گا جو امانت کے سلسلے میں اس ناکارہ نے اب سے صرف چند سطریں پہلے ہی سپرد قلم کی ہے اور اگر اس کے ساتھ اس حدیث کو بھی ملا لیا جائے تو بات معنی خیز حد تک پہنچ جائیگی جس میں قیامت سے متعلق ایک دیہاتی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ جب امانتیں ضائع ہونے لگیں تو سمجھ لو! کہ قیامت قریب آ گئی، سائل کی طلب وضاحت پر ارشاد ہوا کہ جب امور وذمہ داریاں نااہلوں کے سپرد کی جانے لگیں تو امانت ضائع ہوئی اور ضیاع امانت ہے پیش خیمۂ قیامت۔

خدمت خلق

اللہ تعالیٰ نے پوری انسانیت کا نقطۂ آغاز ایک مرد وعورت کو بنا کر ان کی ساری اولاد کو آپس میں بہن بھائی قرار دیا، وجود کی نعمت لیکر دنیا میں آنے والا ہر بچہ خواہ دنیا کی زندگی میں اپنا حصہ وصول کرنے کا اسے موقع مل سکے یا نہ، اسی کنبے کا ایک فرد کہلائیگا اور ظاہر ہے کہ ہر کنبے کا کوئی نہ کوئی سربراہ ہوتا ہے جس کے ذمہ اپنے زیر نگرانی تمام افراد کی رہائش، خوراک اور لباس وغیرہ ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے، آسانی کے لئے یوں لیجئے کہ مخلوق اللہ کا کنبہ ہے جس کی روزی، رہائش، لباس سے لیکر زندگی گذارنے کے لئے ہر ضروری چیز کی فراہمی اللہ نے اپنے ذمے لے رکھی ہے، غالباً یہی وہ چیز ہے جسے اس بلیغ پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے۔

"الخلق عیال اللّٰہ"

"مخلوق، اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے"

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سربراہِ کنبہ ہمیشہ اس بات کا متمنی رہتا ہے کہ اس کے زیر

نگرانی وذمہ داری تمام افراد باہمی پیار ومحبت، خلوص والفت، ایثار وہمدردی اور اپنائیت کے جذبے کے تحت زندگی گذاریں، اس کے لئے وہ مختلف مواقع پر ایسی ہدایات دیتا رہتا ہے جس سے ان تعلقات میں سرد مہری پیدا نہ ہونے پائے اور ہمیشہ پرانی گرم جوشی برقرار رہے۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق میں ہر ایک کو، دوسرے کا ہمدرد، ہمدم اور مونس و غم خوار دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے کہیں ایثار کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا"

(الدھر: ۸)

"اور خود اپنے آپ کو ضرورت ہونے کے باوجود اپنا کھانا مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں"

اور کہیں راہ خدا میں اللہ کا دیا ہوا مال خرچ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

"اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ"

(البقرہ: ۲۷۴)

"جو لوگ اپنے مال کو دن رات، ظاہر وباطن ہر طرح خرچ کرتے رہتے ہیں، ان کے لئے ان کے رب کے یہاں اجر تیار ہے انھیں کسی قسم کا کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے"

یہ تو ایک نمونہ ہے ورنہ سرکار دو عالم ﷺ کی وہ تعلیمات جو اس سلسلے میں اہل اسلام کو دی گئی ہیں، اتنی بے شمار ہیں کہ اگر انہیں چھانٹ کر الگ کیا جائے تو اس سے ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے، بھلا ہم اس نبوی تعلیم کو کیسے فراموش کر دیں۔

"واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ"

"انسان جب تک اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے، اللہ اس کی مدد میں لگا رہتا ہے"

پھر وہ واقعہ اگر بھلانا بھی چاہوں تو لوح ذہن پر وہ اتنا ہی ابھر کر سامنے آتا ہے کہ انسانیت تو بڑی دور کی بات، ایک پیاسے کتے کی جان بچانے اور اس کی پیاس بجھانے پر قدردان اللہ نے ایک شخص کی بخشش اور مغفرت کا فیصلہ فرمالیا، کیا وہ واقعہ کبھی فراموش کیا جاسکے گا جسے تاریخ کے دفینے اپنے خزینے میں شامل کر چکے کہ برا بھلا کہنے والی بڑھیا کا سامان اٹھا کر اسکے گھر تک پہنچانے والا وہی شخص تھا جسے دنیا "جادوگر" کہتی تھی (پیغمبر اسلام ﷺ) کیا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا نمونہ کوئی حکمران پیش کرنے کی ہمت اپنے اندر پاتا ہے کہ ساری زندگی ایک نابینا بڑھیا کی اس تسلسل اور اخفاء کے ساتھ خدمت کرتے رہے کہ ان کے انتقال کے بعد ہی یہ حیرتناک انکشاف دنیا کے سامنے ہوا۔

قابل صد تبریک ہیں وہ لوگ جن کا اوڑھنا بچھونا مخلوق کی راحت رسانی ہے خواہ انہیں اپنی زندگی میں کبھی کوئی راحت نہ ملی ہو، قابل فخر ہیں وہ لوگ جنہیں خدمت خلق میں ہی سکون ملتا ہو گو کہ کسی اور طرف سے انہیں ایک لمحے بھی سکون نہ ملا ہو، خوش نصیب ور ہیں وہ لوگ جو خدمت خلق میں اللہ کی رضا تلاش کر رہے ہوں گو کہ انہیں لوگوں کی طرف سے ناراضگی کے "تمغے" مل رہے ہوں۔

اے کاش! ہم اپنے پروردگار کو اس کی عبادت کر کے، پیغمبر اسلام ﷺ کو طاعت کر کے اور خلق خدا کو خدمت کے ذریعے راضی کر سکیں۔

صبر وشکر

اگر کوئی انسان چراغ لیکر، عمر نوح پاکر اور پہاڑوں جیسا مضبوط ارادہ زادِ راہ لیکر ایسے شخص کی تلاش میں نکل پڑے جس کی پوری زندگی ہر تکلیف سے پاک، ہر نعمت سے معمور اور ہر خوشی سے آراستہ ہو تو شاید ایسا کرنے کو عقلمندی اور ایسا کرنے والے کو عقلمند کہنے کے لئے کوئی بھی تیار نہ ہو اس لئے کہ دنیا کا یہ ضابطہ ہی نہیں، یہ تو ضابطہ اس جگہ کا ہے جسے "جنت" کے ظاہری لفظوں سے اور اہل اللہ کی اصلاح میں "اللہ کے مقام رضا" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جب یہ بات ایک ایسی حقیقت کے طور پر ہر ایک کے سامنے واضح ہے جس کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں تو پھر انسان کو یہ بات بھی ہمیشہ مدنظر رکھنی چاہئے کہ ایک سے دوسرے کو تسلی ہوتی ہے، دوسروں کے مصائب سن کر انسان کو اپنی پریشانیاں، آسانیاں

تعبیر کرتے ہیں جس کا سب سے زیادہ مستحق ہی ہماری نظروں میں سب سے کم حصہ دار ہوتا ہے، جس کی شبانہ روز نعمتوں کی موسلا دھار بارش ہم پر برس رہی ہے۔ اسی کے لئے الحمد للہ کے دو بول ہمارے لئے بڑے مہنگے، قیمتی اور مشکل ہوتے ہیں۔

حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے شکریہ ادا کرنے سے اس کی شان میں کوئی اضافہ نہیں ہو جاتا اور ایسا نہ کرنے سے اسکی شان میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہو جاتی لیکن اس سے انسان کا احسان شناس ہونا یا نہ ہونا ضرور واضح ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ احسان شناس کسی نہ کسی طور پر اپنے محسن کا شکریہ ضرور ادا کرتا ہے خواہ زبان کے ذریعے ہو، اپنے اعضاءِ جسم کو اس کی خدمت میں لگا کر ہو یا قلب کو اس کے احسانات کا معترف سمجھنے کے طور پر ہو اور جس میں یہ صفت نہیں ہوتی اس کا شکر گذار ہونا تسلیم کرنا بھی ضروری نہیں۔

پھر ایک اہم ترین نکتہ اس موقع پر فراموش کر دیا جاتا ہے حالانکہ اسے ہمیشہ اپنے مدنظر رکھنا چاہئے اور وہ یہ کہ شکر نعمتوں میں اضافہ کا سبب بنتا ہے، جو شخص جتنا زیادہ شکر گذار ہوتا ہے، وہ اتنا ہی مطمئن، مسرور اور خوش ہوتا ہے اور اس کی نعمتوں میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہی ہوتا ہے اور جو شخص اس خوبی سے جتنا محروم ہوتا ہے اسے سوائے حالات پر رونے اور شکوہ کرنے کے کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا۔

کون نہیں چاہتا کہ اس کی نعمتوں میں اضافہ ہو جائے اور جن نعمتوں سے وہ مستفید ہو رہا ہے، یا ہونا چاہتا ہے وہ بغیر کسی تعطل اور جمود کے برابر جاری وساری رہیں؟ یقیناً ہر انسان کو اس کی خواہش ہوتی ہے اس کے لئے ذیل کی آیت مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے

"لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ" (ابراہیم:۷)

"اگر تم شکر گزاری کرو گے تو میں تمہاری نعمتوں میں ضرور اضافہ کروں گا"

اس آیت کے ساتھ اگر اس روایت کو بھی ملا لیا جائے تو بات مزید معنی خیز ہو جائے گی اور موجودہ حالات میں انسان کی مجموعی کیفیت کا حقیقی پس منظر بھی واضح ہو جائے گا۔

"من لم يشكر الناس لم يشكر الله"

"جو شخص لوگوں کے احسانات پر ان کا شکر گذار نہیں ہوتا وہ اللہ کا شکر گذار بھی نہیں ہو سکتا"

اصل میں جب انسان کو رونے کی عادت پڑ جائے تو اس کے لئے شکر کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور جس شخص کو شکر گذاری کی عادت پڑ جائے اس کے لئے ''رونا'' مشکل ہو جاتا ہے یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس سے اس نوع کے بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں لیکن حامل قلم انہیں اپنے قارئین کے حوالے کر کے اپنی گفتگو کا محور دوسرے موضوع کے اہم نکات کو بنانا زیادہ پسند کرے گا۔

توکل وقناعت

دنیا دار الاسباب ہے اور اللہ مسبب الاسباب ہے، ایک مسلمان اسباب پر بھروسہ کرتا ہے اور نہ ہی دار الاسباب پر اس کی تمام تر توجہات کا مرکز وہ مسبب الاسباب ذات ہوتی ہے جس کے حکم سے اسباب میں اثر پیدا ہوتا ہے، عام طور پر اس مسئلے میں انسان کو بہت بڑا دھوکہ ہوتا ہے اور وہ اسباب ہی کو ''سب کچھ'' سمجھ کر بیٹھ جاتا ہے، اس کی نظر میں اتنی وسعت نہیں ہوتی کہ وہ اسباب کے ماوراء کسی اور حقیقت کو بھی دیکھ سکے، اور نہ اس کے پاس اتنی فرصت ہوتی ہے کہ وہ کچھ وقت نکال کر اس نکتے پر بھی سوچ سکے کہ اسباب اور مسبب الاسباب میں کیا فرق اور کیسا ربط ہے؟

اسی طرح بعض لوگ ایک اور غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں ''ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں'' ان کے نزدیک اسباب کو اختیار کرنا جرم اور اللہ پر بھروسے کے منافی ہے، راقم الحروف کا ناقص تجربہ یہ ہے کہ درحقیقت ایسے لوگ ''لاپرواہ'' ہوتے ہیں اور اپنی لاپرواہی پر دین کا لیبل لگا کر ''توکل'' کی اصطلاح اس کے صحیح مفہوم میں استعمال کرنے کے بجائے اپنی مرضی کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔

وہ توکل جس کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

''فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ، إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ''

(آل عمران:۱۵۹)

''جب آپ کسی کام کا عزم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ رکھیں، بیشک اللہ متوکلین کو پسند کرتا ہے''

اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اپنی ہمت، حیثیت اور استطاعت کے مطابق اسباب مہیا

کرنے کے بعد اس کا نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے ، اب اگر کوئی شخص اسباب ہی کو مہیا نہ کرے اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے یا کوئی شخص اسباب ہی کو موثر حقیقی سمجھنے لگے ، تو اسے "توکل" ہرگز نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی اسلام اپنے پیروکاروں کو یہ تعلیم دیتا ہے۔

اسی طرح ایک اور اہم ترین خوبی " جو ہماری زندگیوں سے اس طرح رخصت ہو چکی ہے کہ اچھے اچھے لوگ اس کے تذکرے سے بھی دور بھاگتے ہیں " قناعت ہے ، یاد رکھیں ! قناعت ایمان کا نتیجہ ہے اور شکر قناعت کا ثمرہ ، اگر انسان میں ایمان کامل ہو تو وہ ضرور قناعت پسند ہوگا اور جو شخص قناعت پسند ہوگا ، اسے شکر الٰہی کی زیادہ سے زیادہ توفیق ملے گی اور جسے شکر کی توفیق مل جائے ، اس کی نعمتوں میں اضافہ ہونا یقینی ہے اور اسے اللہ کی بارگاہ سے کامیابی کا تمغہ ملنا انعام الٰہی ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

"وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" (الحشر:۹)

" جسے نفس کے بخل سے محفوظ کر دیا گیا ، وہ کامیاب ہو گیا "

تواضع

اسلام جہاں انسان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ وہ خود پسندی میں مبتلا ہو کر دوسروں کو اپنے سے حقیر سمجھنا شروع کر دے " جسے آسانی کے لئے تکبر کی اصطلاح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے " اسی طرح اسلام اس چیز کے حق میں بھی نہیں ہے کہ انسان اپنی عزت نفس کو کسی دوسرے انسان کے سامنے پامال کرتا پھرے اور اپنے آپ کو خود ہی ذلیل کرتا پھرے ، ایسا کرنے کی اجازت صرف پروردگار عالم کے سامنے دی گئی ہے " جسے شریعت کی اصطلاح میں عبادت کہا جاتا ہے اور اسی وجہ سے عبادت اللہ کے علاوہ کسی اور کی جائز نہیں ہے "

تکبر اور ذلت کے درمیان کا جو راستہ ہے ، اسے تواضع کہا جاتا ہے ، یہ اللہ کو بہت محبوب ہے کیونکہ اس کیفیت میں انسان جھک جاتا ہے اور جو جھک جاتا ہے ، اللہ کو اس پر پیار آتا ہے اور وہ خود اسے اٹھاتا ہے اور اتنا اٹھاتا ہے کہ بڑے بڑے اس سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

شاید یہی وہ چیز ہے جسے سرکار دو عالم ﷺ نے اپنے ان بلیغ الفاظ میں ادا فرمایا ہے:

"من تواضع لله رفعه الله و من تكبر وضعه الله"

" جو اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے ، اللہ اسے رفعتیں عطاء فرماتا

ہے اور جو تکبر کرتا ہے، اللہ اسے پستی میں پھینک دیتا ہے"

اس موقع پر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ تکبر کی تعریف بھی سپرد قرطاس وقلم کردی جائے کیونکہ اس مسئلہ میں ہمارے بہت سے احباب غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں اور ہر خوشامد و چاپلوسی سے اپنے آپ کو بچانے والے پر فوراً سے پہلے متکبر ہونے کا فتویٰ لگا دیتے ہیں، اصل میں یہ حضرات تکبر اور استغناء میں فرق نہیں کر پاتے، جس کی بناء پر انہیں بعض اوقات پریشانی کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے اور راقم الحروف کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ اسے بھی ایسے "مہربان" بڑی وافر مقدار میں نصیب ہوتے ہیں جو بڑی بلند آہنگی سے اس پر دن رات یہ فتویٰ جاری کرتے رہتے ہیں، اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تکبر کی وہ تعریف جو خود نبی رحمت ﷺ سے منقول ہے، ذکر کردی جائے اور وہ یہ ہے۔

"الکبر بطر الحق و غمط الناس"

"تکبر نام ہے حق بات کو ٹھکرا دینے اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا"

اس جامع ترین تعریف میں تکبر کے دو جزو بتائے گئے ہیں۔

ا۔ کسی مسئلہ میں اختلاف رائے ہونے اور مدلل بحث کے بعد جب یہ واضح ہو جائے کہ فلاں موقف صحیح ہے اور فلاں رائے غلط، پھر بھی اپنی غلط اور باطل رائے پر ڈٹے رہنا اور ہٹ دھرمی سے صحیح بات کو تسلیم نہ کرنا۔

۲۔ اپنے کسی ہنر اور کمال کے سامنے دوسروں کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھنا یا کسی کے عیوب ظاہری و باطنی میں سے کسی ایک پر اس کی تحقیر کرنا اور اسے اپنے سے کم تر سمجھنا، اسے تکبر کہا جاتا ہے۔

اب فرمایئے! کہ ہماری خود ساختہ تعریف اور اس نبوی تعریف میں زمین آسمان کا فرق ہے یا نہیں؟ ہم دوسروں کو حقیر سمجھتے ہوئے ان ہی پر تکبر کا فتویٰ بھی لگا رہے ہوں تو بتایئے کہ اس لفظ کا صحیح اطلاق نبوی تعریف کے مطابق خود ان پر ہوگا یا نہیں؟ ہم اپنے موقف کے مبنی بر غلط ثابت ہونے کے بعد بھی اپنے موقف پر محض اس وجہ سے ڈٹے رہیں کہ دوسرا موقف مجھ سے جونیئر نے پیش کیا ہے، اس لئے میں نے اسے قبول نہیں کرنا، کیا یہ تکبر ہوگا یا نہیں؟

اگر قارئین یہ شکوہ نہ کریں کہ مؤلف جذباتیت کی رو میں بہہ گیا ہے تو میں بلا تکلف

کرنے کے بعد اس کا نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے ،اب اگر کوئی شخص اسباب ہی کو مہیا نہ کرے اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے یا کوئی شخص اسباب ہی کو موثر حقیقی سمجھنے لگے، € اسے ''توکل'' ہرگز نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی اسلام اپنے پیروکاروں کو یہ تعلیم دیتا ہے۔

اسی طرح ایک اور اہم ترین خوبی ''جو ہماری زندگیوں سے اس طرح رخصت ہو چکی ہے کہ اچھے اچھے لوگ اس کے تذکرے سے بھی دور بھاگتے ہیں'' قناعت ہے، یاد رکھیں! قناعت ایمان کا نتیجہ ہے اور شکر قناعت کا ثمرہ، اگر انسان میں ایمانِ کامل ہو تو وہ ضرور قناعت پسند ہوگا اور جو شخص قناعت پسند ہوگا، اسے شکرِ الٰہی کی زیادہ سے زیادہ توفیق ملے گی اور جسے شکر کی توفیق مل جائے ،اس کی نعمتوں میں اضافہ ہونا یقینی ہے اور اسے اللہ کی بارگاہ سے کامیابی کا تمغہ ملنا انعام الٰہی ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

''وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'' (الحشر:۹)

''جسے نفس کے بخل سے محفوظ کر دیا گیا، وہ کامیاب ہو گیا''

تواضع

اسلام جہاں انسان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ وہ خود پسندی میں مبتلا ہو کر دوسروں کو اپنے سے حقیر سمجھنا شروع کر دے ''جسے آسانی کے لئے تکبر کی اصطلاح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے'' اسی طرح اسلام اس چیز کے حق میں بھی نہیں ہے کہ انسان اپنی عزت نفس کو کسی دوسرے انسان کے سامنے پائمال کرتا پھرے اور اپنے آپ کو خود ہی ذلیل کرتا پھرے، ایسا کرنے کی اجازت صرف پروردگار عالم کے سامنے دی گئی ہے ''جسے شریعت کی اصطلاح میں عبادت کہا جاتا ہے اور اسی وجہ سے عبادت اللہ کے علاوہ کسی اور کی جائز نہیں ہے''

تکبر اور ذلت کے درمیان کا جو راستہ ہے، اسے تواضع کہا جاتا ہے، یہ اللہ کو بہت محبوب ہے کیونکہ اس کیفیت میں انسان جھک جاتا ہے اور جو جھک جاتا ہے، اللہ کو اس پر پیار آتا ہے اور وہ خود اسے اٹھاتا ہے اور اتنا اٹھاتا ہے کہ بڑے بڑے اس سے نیچے رہ جاتے ہیں۔

شاید یہی وہ چیز ہے جسے سرکار دو عالم ﷺ نے اپنے ان بلیغ الفاظ میں ادا فرمایا ہے:

''من تواضع لله رفعه الله و من تكبر وضعه الله''

''جو اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ اسے رفعتیں عطاء فرماتا

ہے اور جو تکبر کرتا ہے، اللہ اسے پستی میں پھینک دیتا ہے"

اس موقع پر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ تکبر کی تعریف بھی سپرد قرطاس وقلم کر دی جائے کیونکہ اس مسئلہ میں ہمارے بہت سے احباب غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں اور ہر خوشامد و چاپلوسی سے اپنے آپ کو بچانے والے پر فوراً سے پہلے متکبر ہونے کا فتویٰ لگا دیتے ہیں، اصل میں یہ حضرات تکبر اور استغناء میں فرق نہیں کر پاتے، جس کی بناء پر انہیں بعض اوقات پریشانی کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے اور راقم الحروف کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ اسے بھی ایسے "مہربان" بڑی وافر مقدار میں نصیب ہوتے ہیں جو بڑی بلند آہنگی سے اس پر دن رات یہ فتویٰ جاری کرتے رہتے ہیں، اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تکبر کی وہ تعریف جو خود نبی رحمت ﷺ سے منقول ہے، ذکر کر دی جائے اور وہ یہ ہے۔

"الکبر بطر الحق و غمط الناس"

"تکبر نام ہے حق بات کو ٹھکرا دینے اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا"

اس جامع ترین تعریف میں تکبر کے دو جزو بتائے گئے ہیں۔

۱۔ کسی مسئلہ میں اختلاف رائے ہونے اور مدلل بحث کے بعد جب یہ واضح ہو جائے کہ فلاں مؤقف صحیح ہے اور فلاں رائے غلط، پھر بھی اپنی غلط اور باطل رائے پر ڈٹے رہنا اور ہٹ دھرمی سے صحیح بات کو تسلیم نہ کرنا۔

۲۔ اپنے کسی ہنر اور کمال کے سامنے دوسروں کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھنا یا کسی کے عیوب ظاہری و باطنی میں سے کسی ایک پر اس کی تحقیر کرنا اور اسے اپنے سے کم تر سمجھنا، اسے تکبر کہا جاتا ہے۔

اب فرمایئے! کہ ہماری خود ساختہ تعریف اور اس نبوی تعریف میں زمین آسمان کا فرق ہے یا نہیں؟ ہم دوسروں کو حقیر سمجھتے ہوئے ان ہی پر تکبر کا فتویٰ بھی لگا رہے ہوں تو بتایئے کہ اس لفظ کا صحیح اطلاق نبوی تعریف کے مطابق خود ان پر ہوگا یا نہیں؟ ہم اپنے موقف کے مبنی بر غلط ثابت ہونے کے بعد بھی اپنے موقف پر محض اس وجہ سے ڈٹے رہیں کہ دوسرا موقف مجھ سے جونیئر نے پیش کیا ہے، اس لئے میں نے اسے قبول نہیں کرنا، کیا یہ تکبر ہوگا یا نہیں؟

اگر قارئین یہ شکوہ نہ کریں کہ مؤلف جذباتیت کی رو میں بہہ گیا ہے تو میں بلا تکلف

عرض کروں کہ ہم نے ہر چیز اور ہر اصطلاح کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا نجانے کب سے اپنا پیدائشی حق سمجھ لیا ہے اور نجانے کس نے اور کب یہ اختیار ہمارے سپرد کر دیا اور صورت حال اس خطرناک حد تک پہنچ چکی ہے کہ اب رشوت کا نام ''ھدیہ'' بن چکا ہے، چاپلوسی کا نام ''تواضع'' رکھا جا چکا ہے، استغناء کا نام تکبر پڑ گیا ہے اور سود کا نام منافع قرار پا گیا ہے۔

ہر شخص اس بات کا مدعی نظر آتا ہے کہ اس نے کلمۂ حق ضرور کہنا ہے خواہ کسی کو کڑوا ہی لگے، لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ کلمہ حق سن بھی سکے، خواہ اسے کڑوا ہی لگے، حق بات کہنے والے جتنے کم ہوتے ہیں، سننے والے اس سے بھی زیادہ کم ہوتے ہیں، لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہم فراموش کر چکے ہیں، اب تو ہر شخص نے زبان کھول لی ہے اور کان بند کر لئے ہیں جبکہ پرانے وقتوں میں '' حالانکہ میں اتنا پرانا نہیں ہوں، صرف ۲۴ سال قبل دنیاءِ رنگ و بو میں قدم رکھ کر آزمائشوں کا حصہ بنا تھا'' بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی کہ کان ہمیشہ کھلے رکھو اور زبان ہمیشہ بند رکھو۔

اے کاش! ہم اس حدیث کے مفہوم کو سمجھ سکیں کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند نہ کرنے لگے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

جہاد

قرآن وحدیث کی مروجہ تمام اصطلاحات میں یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو سب سے زیادہ مظلوم واقع ہوئی ہے اور موجودہ زمانے میں خصوصیت کے ساتھ اس پر ظلم کے جو پہاڑ توڑے گئے ہیں، وہ ناقابل بیان ہیں، کبھی اسے ''غدر'' کہا جاتا ہے اور کبھی اسے اور دہشت گردی کو ایک ہی پلڑے میں تولا جاتا ہے، ماضی میں ''جہاد'' کو قصہ پارینہ بنانے کے لئے انگریزوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کو اپنے آلے کے طور پر استعمال کیا تھا جس نے مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو مجروح کرنے میں اپنی ساری طاقت صرف کر دی لیکن جو کارنامہ ہمارے حکمرانوں نے سرانجام دیا ہے، انگریز کو اس پر فخر بھی ہے اور ناز بھی کیونکہ اس بلند آہنگی سے یہ کام مرزا موصوف بھی سرانجام نہ دے سکا تھا۔

آج جہاد اور دہشت گردی ایک ہی چیز کے دو نام بن چکے ہیں، حالانکہ ان دونوں

کے درمیان وہی فرق ہے جو دن اور رات، سورج اور چاند، اندھیرے اور اجالے، زمین و آسمان کے درمیان ہوا کرتا ہے، جہاد قرآن و حدیث کی اہم ترین اصطلاح ہے جسے ایک افضل ترین عبادت قرار دیا گیا ہے اور دہشت گردی (جس کی صحیح تعریف ہی تا حال معلوم نہیں ہوسکی) کو انتہائی گھناؤنا اور قابل نفرت جرم قرار دیا گیا ہے۔

میں قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کے اس تمام ذخیرے کو جس میں جہاد کے احکام و فضائل وارد ہوئے ہیں، ایک طرف رکھ کر صرف ایک آیت کا ترجمہ پیش کرنا چاہوں گا، اس کی روشنی میں فیصلہ قارئین کے ہاتھ میں ہے۔ سورۂ مبارکہ توبہ میں ارشاد ربانی ہے۔

> ''اے اہل ایمان! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے راہ خدا میں جہاد کے لئے کوچ کرنے کو کہا جاتا ہے تو تم زمین پر بوجھ بن جاتے ہو، کیا تم آخرت کی زندگی کے مقابلے میں دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو؟ یاد رکھو! دنیوی زندگی کا سارا ساز و سامان آخرت کے مقابلے میں انتہائی تھوڑا ہے، اگر تم راہ خدا میں جہاد کے لئے نہ نکلے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا اور تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئیگا اور تم اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے'' (التوبہ: ۳۹،۳۸)

میرے عزیز! جہاد میں شرکت کرنے کا جذبہ اپنے دل میں ہمیشہ موجزن رکھنا چاہئے لیکن اگر عملی طور پر کسی وجہ سے اس میں شرکت کا موقع نہ مل سکے، تب بھی اس کی حقانیت کا اعتقاد تو کم از کم اپنے دل میں رکھے، اسے اللہ کی طرف سے عائد کیا جانے والا فرض کفایہ تو سمجھے، مجاہدین کے ساتھ اپنی قلبی و مالی ہمدردیاں تو وابستہ رکھے تا کہ کسی نہ کسی درجے میں اس اسلامی اصطلاح کے ساتھ تعلق برقرار رہ سکے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطاء فرمائیں۔

نواہی کا بیان

اہل ایمان کی وہ تیسری اہم ترین ذمہ داری جس کا قرآن کریم ان سے مطالبہ کرتا ہے، اوامر پر عمل اور نواہی سے اجتناب ہے جس کے جزءِ اول پر قدرے اختصار کے ساتھ

گذشتہ صفحات میں چند باتیں عرض کی گئی ہیں اوران کے ضمن میں چند نواہی کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے مثلاً شرک و بت پرستی کی ممانعت، خود پسندی اور تکبر کی روک تھام، خیانت سے اجتناب اور یتیم کے مال کو ناحق اور ظلماً اپنے تصرف میں لانے سے شدت کے ساتھ ممانعت وغیرہ۔

اب چند اور چیزیں اس عنوان کے تحت ذکر کی جاتی ہیں تاکہ ہر مسلمان پر یہ واضح ہو سکے کہ اسے کن چیزوں سے روکا گیا ہے اوران چیزوں سے رکنا اس کا مذہبی فریضہ ہے، اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم اس کتاب کو پڑھے تو اس کے سامنے بھی اسلامی تعلیمات کا یہ رخِ روشن نکھر کر آ سکے اور وہ یورپ ومغرب کے پھیلائے ہوئے منفی پروپیگنڈے کے زہریلے اثرات سے بچ سکے۔

فتنہ وفساد، دہشت گردی

قرآن کریم میں تین قسم کے گروہ بکثرت زیر بحث آئے ہیں، بعض لوگ تو وہ ہیں جو کامل ایمان دار ہیں، بعض وہ ہیں جو مکمل طور پر ہٹ دھرمی میں مبتلا ہیں اور بعض وہ ہیں جو نہ تین میں ہیں نہ تیرہ میں، پہلی قسم کے لوگ مومن، دوسری قسم کے لوگ کافر اور تیسری قسم کے لوگ ''منافق'' کہلاتے ہیں۔

ہر انسان سمجھ سکتا ہے کہ ''منافق'' کبھی کسی کے ساتھ مخلص نہیں ہو سکتا، وہ ہمیشہ دوغلے پن کا مظاہرہ کرتا ہے، وہ ہمیشہ تذبذب کا شکار رہتا ہے اوراس کی حقیقت واضح ہونے پر کوئی بھی اس کی ہم نشینی سے خوش نہیں ہوتا ایسے لوگوں کی شناخت ان علامات کے ذریعے کی جا سکتی ہے جو قرآن وحدیث میں بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں۔

انہی علامات میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ زمین میں فتنہ وفساد پھیلاتے پھرتے ہیں، بھائی کو بھائی سے لڑانا، دوست کو دوست سے لڑانا، مالک اور ملازم میں نفرتیں پھیلانا، میاں بیوی کے درمیان ناچاقیاں پیدا کرنا، والدین اور اولاد کو ایک دوسرے سے دور کرنا، رشتہ داروں میں باہمی منافرت پیدا کرنا، استاذ اور شاگرد کے درمیان رکاوٹیں پیدا کرنا، چھوٹوں اور بڑوں کے درمیان فصل پیدا کرنا انکی خصلت اور عادت ثانیہ بن جاتی ہے، انہیں ان ہی کاموں میں سکون آتا ہے اور ایسا کرنا ان کی فطرت کا حصہ بن جاتا ہے۔

قرآن کریم ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

''وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ''

(البقرہ:١١،١٢)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت پھیلاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں، یاد رکھو! اصل مفسد یہی لوگ ہیں لیکن انہیں شعور نہیں ہے''

زمین میں فساد کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ بچوں کو یتیم، عورتوں کو بیوہ، بچیوں کو بے سہارا اور والدین کو بے آسرا کرکے ان سے ان کا نور نظر چھین لیا جائے، اسی طرح خالص اسلامی اجتماعات ''جن میں دین اور صاحب دین ﷺ کا بابرکت تذکرہ ہورہا ہو'' میں شرکت کرنے والوں کو ہراساں کرنا، ان پر حملہ کرکے جانی و مالی نقصان پہنچانا اور اس پر ثواب کی امید رکھنا، راہ چلتے مرد و عورت کو لوٹ لینا اور کرائم سٹریٹ میں ملوث ہونا بھی زمین میں فساد کی صورت ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ کام جس سے ایک مسلمان کی دینی و دنیوی زندگی متاثر ہوتی ہو، مسلمانوں کو اس سے روکا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے۔

''وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ'' (البقرہ:١٩١)

''فتنہ پھیلانا کسی کو قتل کرنے سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے''

سورہ بقرہ ہی میں ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے۔

''وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ'' (البقرہ:٢١٧)

''فتنہ پھیلانا کسی کو قتل کرنے سے بھی بڑا گناہ ہے''

ان دونوں آیتوں کو سامنے رکھ کر بآسانی یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ فتنہ وفساد پھیلانا کس قدر شدید اور بڑا گناہ ہے، ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی بھی فتنہ کا حصہ بننے سے مکمل طور پر بچا کر رکھے اور ہمیشہ یہ دعا کرتا رہے۔

''رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا''

(الممتحنہ:٥)

''اے ہمارے پروردگار! ہمیں کافروں کے لئے تختۂ مشق نہ بنادیجئے گا اور اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو معاف فرمادیجئے گا''

غیر مسلموں سے قلبی محبت

چونکہ اسلام ایک عالمی دین ہے اوراس کی تعلیمات میں وہ عالمگیریت، ہمہ جہتی اور آفاقیت ہے جو کسی دین و مذہب میں نہیں ہے اس لئے دنیا کے تمام مذاہب ایک طرف ہیں اور اسلام ایک طرف، یہی وجہ ہے کہ جب بھی اسلام کے خلاف اغیار نے سازشیں کیں تو دنیا کے تمام مذاہب اس کوشش میں ان کے ساتھ شریک ہوگئے اور اپنی اپنی ہمت کے مطابق اسلام کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کی کوششوں میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، جس کا واضح مطلب یہ ہوا

''الکفر ملة واحدة''

''سارا کفر ایک ہی ملت ہے''

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال گذر جانے کے باوجود آج تک اسلام کو مٹانے کی سازشیں ہو رہی ہیں،'' یہ الگ بات ہے کہ اسلام مٹنے کے لئے نہیں آیا، یہ تو مٹانے کے لئے آیا ہے، کسے؟ باطل کو، طاغوتی طاقتوں کو اور کفر کی سازشوں کو'' ظاہر ہے کہ اسلام کے خلاف ہونے والی ان سازشوں کا مرکزی کردار اسلام کا خیر خواہ کبھی نہیں ہوسکتا اور ان ''ہدایات'' پر عمل کرنے والا کبھی اپنے ضمیر کے ساتھ مخلص نہیں ہوسکتا۔

ان دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر ایک حقیقت بیں یقیناً یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ پھر ہم ایسے لوگوں سے محبت کی پینگیں کیوں بڑھائیں جو ہمارے دین اور دنیا کے بارے کبھی بھول کر بھی اچھا نہیں سوچ سکتے؟ پھر ایسے لوگوں سے ہمارے قلبی تعلق کا کیا مطلب ہے جو اپنے مفادات کی خاطر ہماری جان و مال سے کھیلنا اپنا حق سمجھتے ہیں؟ پھر ایسے لوگوں کو آئیڈیل بنانا ہمارے لئے کس طرح روا ہوسکتا ہے جو ہماری آئیڈیل شخصیات پر کیچڑ اچھالتے ہیں؟ پھر ایسے لوگوں سے دوستی قائم کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے جو ہمارے دوست کبھی نہیں ہوسکتے؟ شاید یہی وہ حقیقت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے انتہائی فصیح و بلیغ انداز میں بیان فرمایا ہے۔

''اے اہل ایمان! اپنوں کے علاوہ کسی کو اپنا بھیدی نہ بناؤ، وہ تمہیں

نقصان پہنچانے میں کسی طرح کی کمی نہیں کرتے، بلکہ تمہیں جتنی تکلیف پہنچتی ہے، انہیں اتنی ہی خوشی ہوتی ہے، دشمنی ان کے منہ سے پھوٹی پڑتی ہے اور جو سازشیں ان کے دلوں میں پوشیدہ ہیں، وہ اس سے بھی زیادہ ہیں، ہم نے پتے کی ساری باتیں تمہارے سامنے واضح کردی ہیں اگر تم عقلمند ہو، یاد رکھو! تم لوگ ان سے محبت کرتے ہو، لیکن وہ تم سے بالکل محبت نہیں کرتے، حالانکہ تم ساری کتابوں پر ایمان بھی رکھتے ہو، یہ لوگ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لاچکے اور جب تنہا ہوتے ہیں تو غصہ کے مارے اپنی انگلیاں تم پر کاٹ کاٹ کھاتے ہیں، آپ کہدیجئے کہ تم اپنے غصہ میں مرو، اللہ سینوں کے رازوں سے خوب واقف ہے، اگر تمہیں کوئی نفع اور بھلائی ملتی ہے تو وہ انہیں ناگوار گذرتی ہے اور اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو بڑے خوش ہوتے ہیں'' (آل عمران: ۱۱۸ تا ۱۲۰)

اس پیرے کو بار بار پڑھئے اور موجودہ حالات پر چسپاں کر کے دیکھئے، کیا ہم اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں یا نہیں؟ پھر بتایئے کہ اگر قرآن کریم غیر مسلموں سے قلبی محبت کی ممانعت کرتا ہے تو اس میں فائدہ کس کا ہے؟ قرآن کریم کو یہ فائدہ اس قدر عزیز ہے کہ اس نے بڑے سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

''مسلمانوں کو چھوڑ کر مسلمان کسی کافر کو دوست نہ بنائیں، جو شخص ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں، ہاں! اگر ان سے بچاؤ کے لئے بناوٹی دوستی کا اظہار کرو تو بات جدا ہے'' (آل عمران: ۲۸)

اس آیت کی وضاحت میں یہ خوبصورت پیرا بھی پڑھئے۔

''جب حکومت و سلطنت، جاہ و عزت اور ہر قسم کے تقلبات و تصرفات کی زمام اکیلے خداوند قدوس کے ہاتھ میں ہوئی تو مسلمانوں کو جو صحیح معنی میں اس پر یقین رکھتے ہیں، شایان نہیں کہ اپنے اسلامی بھائیوں کی اخوت و دوستی پر اکتفاء نہ کر کے خواہ مخواہ دشمنانِ خدا کی

موالاۃ ومداراۃ کی طرف قدم بڑھائیں، خدا ورسول کے دشمن کبھی ان کے دوست نہیں بن سکتے، جو اس خبط میں پڑے گا، سمجھ لو کہ خدا کی محبت وموالات سے اسے کچھ سروکار نہیں'' (تفسیر عثمانی)

آخر میں مسئلہ کے طور پر ایک بات عرض کرتا چلوں کہ انسانیت کے ناطے کسی مظلوم کی خدمت کرنا، اس کے لئے دوا وغیرہ کا انتظام کرنا، اس کے ساتھ کاروباری مراسم رکھنا اور انسانیت کی حیثیت سے اس کی مناسب عزت کرنا اہل ایمان کی ذمہ داری ہے، اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں، البتہ اس سے قلبی محبت رکھنا اور اس کی محبت میں سب کچھ فراموش کر دینا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔

جھوٹ، دھوکہ، رشوت اور ناپ تول میں کمی

ایک ایسے معاشرے کا تصور کیجئے جس میں ہر شخص پابندی کے ساتھ اس چیز کا اہتمام کرتا ہو کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے، اس نے سچ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا، وہ تجارت بھی سچائی کے ساتھ کرے گا اور عبادت بھی، معاملات بھی سچائی کے ساتھ طے کرے گا اور اخلاقیات میں بھی سچائی کو مقدم رکھے گا، زندگی کے ہر مرحلے اور ہر لمحے کو وہ ''سچائی'' کے زیور سے آراستہ رکھے گا۔

ایک ایسا معاشرہ جس میں ہر شخص دوسروں کو اپنا بھائی سمجھتا ہو اور اس کا ذہن کبھی اس بات پر آمادہ نہ ہوتا ہو کہ وہ اپنے بھائی کو دین یا دنیا کے کسی بھی شعبے میں دھوکہ دے، خواہ اس کا تعلق امانت سے ہو یا مشاورت سے، اشیاء ضرورت سے ہو یا دینیات سے، وہ کبھی دو نمبر چیز کو ایک نمبر کہہ کر بیچنے پر آمادہ نہ ہو، وہ کبھی ملاوٹ شدہ چیز کو اصل کہہ کر بیچنے پر تیار نہ ہو، وہ کم قیمت چیز کو مہنگے داموں فروخت کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہو، وہ کبھی اپنے بھائی کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے دھوکہ دینے پر آمادہ نہ ہو۔

ایک ایسا معاشرہ جس میں ہر شخص اپنی محنت کی کمائی کو ہی اپنا حق سمجھتا ہو، اس کی نظر کبھی دوسروں کی دولت پر نہ جاتی ہو، وہ ہدیئے کے نام پر لوگوں کی جیبیں صاف نہ کرتا ہو، تحائف کے نام پر لوگوں کی مجبوری کا مذاق نہ اڑاتا ہو اور رشوت خوری اس کی عادت نہ بنی ہو۔

ایک ایسا معاشرہ جس میں ہر شخص حقدار کو اس کا مکمل حق دینا ضروری سمجھتا ہو، قیمت پوری

لیکر ڈنڈی مارنے کی بیماری میں مبتلا نہ ہو، لیتے وقت زیادہ اور دیتے وقت کم دینے کا خواہش مند نہ ہو، اس کے ترازو کے باٹ میں کوئی خرابی نہ ہو، اسکی تول اور ماپ بہت اچھی ہو۔

جس معاشرے کی یہ تصویر ہو، کیا وہ رشک انسانیت ہوگا یا نہیں؟ کیا وہاں رہنا ہر انسان پسند کرے گا یا نہیں؟ کیا وہاں کے رہنے والے خوشحال، تندرست اور صحت مند ہوں گے یا نہیں؟ کیا وہاں کے رہنے والے معاشرتی اور جسمانی بیماریوں سے محفوظ ہوں گے یا نہیں؟

یقیناً ان تمام سوالوں کا جواب اثبات میں ہونا چاہئے اور یہی اسلام چاہتا ہے کہ اس کی روشن تعلیمات کے تحت ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ تشکیل دیا جائے جس میں جھوٹ کے نام سے بھی نفرت کی جاتی ہو، جس میں رشوت خور کے لئے کوئی ٹھکانہ نہ ہو، جس میں دھوکہ دہی کا دور دور تک کوئی تصور نہ ہو اور جس میں ناپ تول کے اعتبار سے کسی کو شکایت نہ ہو چنانچہ جھوٹ کی مذمت و برائی بیان کرتے ہوئے ارشاد ربانی ہے۔

"وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ" (الحج:۳۰)

"جھوٹ بولنے سے اجتناب کرو"

دھوکہ دہی کا انجام بد ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے:

"وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ" (آل عمران:۱۶۱)

"جو شخص کوئی چیز چھپا کر دھوکہ دے، وہ قیامت کے دن اس چھپائی ہوئی چیز کو لائے گا"

دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم جن کا منتظر ہے، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

"سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ" (المائدہ:۴۲)

"جھوٹ بولنے کے لئے جاسوسی کرنے والے اور بڑے رشوت خور لوگ"

ناپ تول میں کمی کا ارتکاب کرنے پر قوم شعیبؑ کو تباہ و برباد کر دیا گیا اور آئندہ بھی ایسا کرنے والوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

"ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے ہلاکت و بربادی ہے، جو

لوگوں سے ماپ کر لیتے ہوئے پورا پورا وصول کرنا چاہتے ہیں اور جب خود ماپ یا تول کر دیتے ہیں تو اس میں کمی کر دیتے ہیں''

(المطففین:۱ تا ۳)

یہ وہ امور ہیں جنہیں ترک کر کے ایک پر امن، صحت منداور خوبصورت معاشرہ تشکیل دیا جاسکتا ہے، ایک ایسا معاشرہ جس کے ہر فرد کو دوسرے سے ہمدردی ہو، ایک کو دوسرے سے تقویت ملتی ہو، ایک سے دوسرے کے مسائل حل ہوتے ہوں، ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں یکساں طور پر شریک ہوا جاتا ہو۔

جذباتیت کا شکار ہوئے بغیر اگر میں قسم کھا کر عرض کروں تو انشاءاللہ میری قسم غلط اور جھوٹی بات پر نہ ہوگی کہ اپنے معاشرے سے جھوٹ، رشوت، دھوکہ اور ناپ تول میں کمی کی لعنت کو دور کرنے کی ضمانت آپ مجھے دیجئے، امن وامان، اطمینان وسکون اور زندگی میں راحت وچین کی ضمانت میں آپکو دیدیتا ہوں، آپ یقین کیجئے کہ جس دن ہمارے معاشرے سے یہ بیماریاں رخصت ہوگئیں، اسے ترقی کی راہ پر گامزن ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک اہم ترین چیز احساس ذمہ داری بھی ہے جس کا فقدان تقریباً ہر جگہ، ہر ادارے، ہر مدرسہ، ہر سکول وکالج اور ہر فرد میں پایا جارہا ہے، اللہ کرے کہ ہم میں احساس ذمہ داری پیدا ہو جائے۔ آمین

تبصرہ

وہ احکام جن کا اہل ایمان سے قرآن کریم میں مطالبہ کیا گیا ہے اور وہ نواہی جن سے بچنے کا اہتمام مطلوب قرار دیا گیا ہے، اختصار کے ساتھ آپ کی بصارت سے گذر کر بصیرت افروز ہوئے، مجھے اس بات کا احساس ہے کہ تمام اوامر ونواہی کو اس میں ذکر نہ کیا جاسکا اور بہت سی چیزیں چھوٹ گئیں مثلاً نواہی کے بیان میں

۱۔ کسی کا مذاق نہ اڑایا جائے، اس کے جسمانی یا مالی نقائص وعیوب پر اس کی عزتِ نفس کو پائمال نہ کیا جائے۔

۲۔ کسی کو غلط، برے یا نامناسب نام سے نہ پکارا جائے اور نہ ہی کسی کا نام بگاڑا جائے۔

۳۔ بدگمانی سے حتی الوسع اجتناب کیا جائے۔

۴۔ جاسوسی اور کسی کی ٹوہ میں لگے رہنے سے پرہیز کیا جائے۔

۵۔ غیبت، بہتان تراشی اور الزام لگانے سے بچا جائے۔

۶۔ کسی کی ماں، بہن اور بیٹی پر غلط نظر نہ رکھی جائے اور نامحرموں پر اپنی نظر نہ پڑنے دی جائے، وغیرہ۔

اسی طرح اوامر کے بیان میں

۱۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے سلام اور اجازت لی جائے۔

۲۔ رزق حلال کا انتہائی اہتمام کیا جائے۔

۳۔ اتباع شیطان سے بچا جائے وغیرہ۔

تاہم اس بات کی امید ہے کہ اگر ہم ان ہی ذمہ داریوں کی تکمیل کرلیں تو ہماری زندگی بھی سنور جائے، آخرت بھی نکھر جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ ورسول کی رضا بھی حاصل ہو جائے، جس سے بڑی نعمت دنیا میں تو خیر کوئی نہیں ہے اور آخرت کی بھی دو بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے۔

یاد رکھئے! جنت کی تمام نعمتوں میں سے دو نعمتیں سب سے زیادہ اہم ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی رضامندی وخوشنودی

۲۔ اللہ تعالیٰ کا دیدار اور زیارت

دعاء ہے کہ پروردگار عالم ہمیں اوامر پر عمل، نواہی سے اجتناب اور اس کے نتیجے میں یہ دونوں نعمتیں عطا فرمائے جو یقیناً اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں میں منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔

☆......☆......☆......☆......☆

کی لگام ڈالی جائیگی''

اس حدیث سے ''اللہ کی لعنت'' کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ ایسا شخص رحمت الہیہ سے دور اور غضب الٰہی کا مورد بن جاتا ہے، جنت کے استحقاق سے محروم اور جہنم میں جانے والوں کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے اس لئے انسان اگر دینی مسائل کا عالم ہو اور اسے احکام و مسائل کا ''علم'' ہو (علم کا اطلاق ان چیزوں پر کیا جارہا ہے جو قطعی، حتمی اور یقینی طور پر معلوم ہوں، کوئی مستند کتاب یا کوئی مستند استاذ اس کا ماخذ ہو) تو اسے دوسروں تک پہنچا دینا چاہئے تاہم اس میں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ کسی نااہل کے سامنے علمی باتوں کو بیان کرنا ایسے ہی ہے جیسے خنزیر کے گلے میں ہیرے موتیوں کا جڑاؤ ہار ڈال دیا جائے اور یہ وہی تشبیہ ہے جس کا ذکر سنن ابن ماجہ کی حدیث میں بھی آتا ہے، اس لئے جو لوگ اس کے صحیح اہل ہوں، ان تک اپنے علوم کا فیضان پہنچانے سے کسی صورت احتراز نہیں کرنا چاہیے۔



لوگوں کو اچھی بات کی تلقین کرنا اور برائیوں پر ٹوکنا زمانہ ماضی میں انبیاء علیہم السلام کا فرض منصبی تھا اور انہیں دیگر ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس ذمہ داری کا بھی پابند بنایا جاتا تھا تاکہ لوگوں کے لئے نیکی پر چلنا آسان اور گناہ کا ارتکاب مشکل ہو جائے، اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم لوگ اچھائی کو اچھائی اور برائی کو برائی تو سمجھیں۔

انسانیت کا ہمیشہ سے یہ المیہ رہا ہے کہ گناہ بھی کرتے ہیں اور اسے گناہ سمجھنے کے لئے تیار بھی نہیں ہوتے، اسی طرح نیکی کی راہ پر چلتے بھی نہیں اور چلنے کو نیکی سمجھتے بھی نہیں حالانکہ یہ ایک انتہائی خطرناک مرض ہے جو بعض اوقات اس حد تک مہلک ہو جاتا ہے کہ انسان کی جان لے لیتا ہے، لیکن کسی علاج سے ختم نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی دوا اس پر اثر انداز ہوتی ہے، یہ وہی بیماری ہے جس میں بڑے بڑے مشرک افراد مبتلا رہے ہیں مثلاً فرعون، نمرود، شداد، ہامان، قارون، ابوجہل اور ابولہب وغیرہ اور اسی کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

''وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ''

(المومن: ۳۷)

''اسی طرح فرعون کے لئے اس کی بدعملی کو مزین کر دیا گیا اور اسے
سیدھے راستے سے ہٹا دیا گیا''

انسان کو اس بیماری سے ہمیشہ پناہ مانگنی چاہیے اور اپنے ایمان کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کیونکہ گناہ کرنا تو قابل مواخذہ ہے ہی، لیکن اسے گناہ نہ سمجھنا بھی قابل مواخذہ ہے اور اگر کوئی انسان گناہ کو گناہ سمجھتے ہوئے کرے تو اس کی سزا میں بھی تخفیف ہوگی۔

تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہ سمجھا جائے کہ گناہ کو گناہ سمجھ کر خوب جی بھر کر کرو، چوری کرتے وقت بس یہ سوچ لو کہ چوری کرنا گناہ ہے اور پھر لاکھوں کی چوری کر لو کوئی فرق نہیں پڑے گا یا بدکاری کو گناہ سمجھے لیکن پھر بھی اپنے جذبات کی تکمیل میں خوب مصروف رہے، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ایک وہ آدمی ہے جو اگرچہ گناہ کرتا ہے لیکن اسے اچھا نہیں سمجھتا، طبیعت یا کسی مجبوری کیوجہ سے اس کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے اور ایک آدمی وہ ہے جو گناہ بھی کرتا ہے اور اسے برا بھی نہیں سمجھتا، ان دونوں کی سزا برابر نہیں ہوگی، سزا اگرچہ دونوں کو ملے گی لیکن پہلے کو کم اور دوسرے کو زیادہ اور وجہ اس کی ظاہر ہے۔

شاید قارئین کرام نیکی اور بدی کی جامع اور مختصر تعریف سے ناواقف ہوں اور وہ نیکی اور گناہ کے درمیان صحیح طرح امتیاز نہ کر سکیں، اسلئے ان دونوں کی وہ تعریفیں ذکر کی جاتی ہیں جو خود حضور نبی مکرم، سرور دو عالم ﷺ سے منقول ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

الاثم ما حاك فی صدرك و كرهت ان يطلع عليه الناس
و البر حسن الخلق''

''گناہ اسے کہتے ہیں جو آپکے دل میں کھٹکے اور آپ اس بات کو ناگوار
سمجھیں کہ لوگوں اس پر مطلع ہوں اور نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے''

اسے ایک عام فہم مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ کوئی ایسا آدمی جس نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہ بولا ہو، کسی وجہ سے کسی موقع پر جھوٹ بول دے تو اس کا ضمیر اسے بار بار ملامت کرتا ہے اور اس کے دل سے بار بار یہ آواز آتی ہے کہ تو نے اچھا نہیں کیا، لیکن جب

اسے اس کی عادت پڑ جائے اور وہ اسے ایک معمولی کام سمجھنے لگے تو اس کا ضمیر بھی اسے ملامت کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

یا وہ آدمی جس نے زندگی میں کبھی چوری نہ کی ہو، پہلی مرتبہ جب وہ کوئی چیز چھپاتا ہے تو اس کے ہاتھ کانپ رہے ہوتے ہیں، دل لرز رہا ہوتا ہے، جسم پر کپکپی طاری ہوتی ہے، پیشانی پر پسینہ کی بوندیں ہوتی ہیں اور یہ خوف ستا رہا ہوتا ہے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے، اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟

بس! جہاں انسان کا ضمیر اسے کسی کام کے کرنے پر ملامت کرے یا لوگوں کے دیکھ لینے کا اندیشہ دامن گیر ہو، سمجھ لینا چاہئے کہ یہ گناہ کا کام ہے، اسے ترک کرنے میں ہی عافیت اور اللہ کی رضامندی پنہاں ہے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب ایک آدمی جھوٹ بولنے اور چوری کرنے کا عادی ہو جائے، اسے اس کا ضمیر ملامت کرتا ہو اور نہ اسے لوگوں کے دیکھ لینے کا اندیشہ ہو تو کیا اسے گناہ نہیں کہا جائے گا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا گناہ ہونا تو ہر انسان کے سامنے واضح ہے، رہا وہ متعلقہ آدمی تو اس کے لئے نیکی اور بدی کا یہ معیار اسی وقت تک مفید ہو سکتا ہے جب تک اس کے ضمیر میں حیات کا کوئی اثر موجود ہو، وہ مکمل طور پر مردنی کا شکار نہ ہو گیا ہو اور اس میں ''احساس'' کی کوئی رمق باقی ہو، ورنہ یہی وہ چیز ہے جس کا تذکرہ عنقریب کیا گیا یعنی بدعملی کو مزین بنا دینا، جس کے بعد انسان میں یہ صلاحیت ہی نہیں رہتی کہ وہ نیکی اور بدی میں امتیاز کر سکے۔

بہر حال! گناہ کی تعریف تو آپ کے سامنے آئی اور نیکی کی تعریف اس سے بھی زیادہ آسان ہے یعنی نیکی نام ہے اچھے اخلاق کا جس آدمی کے اخلاق اچھے ہوں، اس کے کردار، گفتار اور رفتار سے لوگ خوش ہوں، اس کے ''معاملات'' سے لوگ مطمئن ہوں، اس کی تجارت پر کسی کو اعتراض نہ ہو، اداءِ قرض و امانت میں لوگ اس پر اعتماد کرتے ہوں، اس کی عبادات بھرپور ہوتی ہوں اور جو اخلاق حسنہ سے متصف ہو، اسے یقیناً نیک اور اس کے ان اعمال کو نیکی سمجھنا چاہئے۔

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا بھی ضروری ہے جو ''اچھے اخلاق'' کے لفظ سے عام طور

پر لوگوں کو ہوتی ہے کہ اس کا مطلب صرف اتنا ہی ہے کہ کسی سے ہنس کر بول لیا جائے یا کسی کی خوشامد اور چاپلوسی میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے جائیں، خواہ پیٹھ پیچھے وہ ہماری ہی برائیاں کرتا پھرے، ہمارے تعلقات ہی کو خراب کرتا پھرے اور ہمیں نقصان پہنچانے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے۔

یاد رکھیں! ''اچھے اخلاق'' صرف کسی سے ہنس کر بول لینے کا نام نہیں ہے، اچھے اخلاق کا حامل اسی شخص کو قرار دیا جا سکتا ہے جس میں صبر، شکر، حسن نیت، توکل، قناعت، رضا بر قضاء جیسے عمدہ نمونے موجود ہوں، اگر کسی شخص میں یہ اوصاف موجود نہ ہوں تو اسے حقائق کی روشنی میں اچھے اخلاق کا حامل قرار دینا انصاف کا خون ہوگا اور ہمارے معاشرے کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ یہاں انصاف کا خون بہت ارزاں ہے، ہر خوشامدی ''اچھے اخلاق'' کے لئے دنیا بھر میں شیطان سے زیادہ مشہور ہوتا ہے اور جس بیچارے میں مذکورہ اوصاف پائے جاتے ہوں، اسے کوئی خاطر میں لانے کے لئے تیار نہیں ہوتا، یہ الگ بات ہے کہ وہ بھی لوگوں سے کسی داد کا متمنی نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے بھی کوئی جاننے والا ہو۔

بہر حال! بات دور نکل گئی، عرض یہ کرنا چاہ رہا تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بنیادی طور پر انبیاء علیہم السلام کا فرض منصبی رہا ہے اور ان کے واسطے سے امت کا ہر فرد اس بات کا مکلّف ہوتا تھا کہ وہ اپنی حیثیت اور استطاعت کے بقدر اس فریضے کی ادائیگی میں اپنا کردار ادا کرے چنانچہ مشکوٰۃ شریف کی وہ مشہور روایت آپ نے بارہا سنی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو ایک خاص بستی کے متعلق حکم دیا کہ اسے وہاں کے رہنے والوں پر الٹ دیں، عرض کیا گیا کہ اس بستی میں آپ کا فلاں بندہ بھی تو رہتا ہے، جس نے پلک جھپکنے کے بقدر بھی آپکی نافرمانی نہیں کی، ارشاد ہوا کہ اب بھی حکم وہی ہے جو ہم دے چکے اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے میری نافرمانی ہوتے ہوئے دیکھی لیکن اس کی پیشانی پر کبھی بل نہیں پڑا۔

معلوم ہوا کہ اپنے اپنے مقام و مرتبہ کے مطابق ہر شخص کو اس کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا، تاہم کسی امت کی شناخت صرف اس فریضے کے حوالے سے قرآن و حدیث میں نہیں ملتی، یہ

خصوصیت صرف اس امت مسلمہ کی ہے جس کے حق میں فرمایا گیا ہے۔

”کُنتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ“ (آل عمران:۱۱۰)

”تم ایک بہترین امت ہو، جسے لوگوں کے لئے خاص اس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ تم اچھی باتوں کی تلقین کرو گے، برے کاموں سے روکو گے اور اللہ پر ایمان لاؤ گے“

اسی لئے امت مرحومہ کے ہر فرد کو اپنے ”بہترین امت“ ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اس فریضے کی ادائیگی میں حصہ دار بننا چاہئے خواہ اس کی کوئی بھی صورت ہو، تاکہ قرآن کریم کا یہ حکم اپنی کامل ترین صورت میں پورا کیا جا سکے۔

”وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ“

(آل عمران:۱۰۴)

”تم میں سے ایک جماعت تو ایسی ضرور ہونی چاہئے جو خیر کی داعی، معروف کی آمر اور منکر سے ناہی ہو، یہی لوگ کامیاب ہیں“

تبصرہ

اہل ایمان کی یہ وہ چوتھی اہم ترین ذمہ داری ہے جس کا قرآن کریم اہل ایمان سے مطالبہ اور تقاضا کرتا ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے سے کسی صورت غافل نہ ہوں، تاہم اس میں دو باتیں قابل غور و اصلاح ہیں، جن کی طرف بسا اوقات توجہ نہیں کی جاتی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کسی خاص صورت میں بند نہیں بلکہ تحریر و تقریر، دعوت و تبلیغ، تصنیف و تالیف اور درس و تدریس وغیرہ تمام صورتیں اسی فریضے کی ادائیگی کے مختلف شعبے ہیں، ان میں سے کسی ایک کی ضرورت سے انکار، بداہت کا انکار کرنے کے مترادف ہے اور ان میں سے کسی ایک ہی کو خاص کر کے متشددانہ طریقہ اختیار کر کے دوسروں پر تنقید کرنا یقیناً سنجیدہ لوگوں کا طریقہ نہیں ہے، اہل عقل و دانش کا یہ

طریقہ نہیں ہے کہ وہ اپنی منتخب کردہ راہ ہی کو صحیح اور دوسرے تمام راستوں کو غلط قرار دینا شروع کردیں اور اس سلسلے میں کسی کی بات سننے کے لئے تیار نہ ہوں کیونکہ یہ ایک فطری سا اصول ہے کہ جہاں کسی مسئلے میں ''تشدد'' پیدا ہوتا ہے، وہاں ''تفرد'' خود بخود پیدا ہوتا ہے اور ''تفرد'' کا لازمی نتیجہ ''تنفر'' ہے جو قرآن و حدیث کی تعلیمات کے یکسر خلاف ہے، اس لئے ہمیں اپنے دلوں میں اتنی کشادگی پیدا کرنی چاہیے کہ دین کے بقیہ شعبوں کا احترام کرنا بھی ہمارے لئے ممکن اور آسان ہو سکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مختلف درجے ہیں اور ہر انسان اپنے درجے کا مکلّف ہے، اس بات کی وضاحت کے لئے وہ مشہور حدیث پیش کرنا ہی کافی ہے جو مشکوٰۃ شریف میں منقول ہے۔

''من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فان لم يستطع فبلسانه، فان لم يستطع فبقلبه، و ذلك اضعف الايمان''

''تم میں سے جو شخص کوئی گناہ ہوتا ہوا دیکھے، اسے چاہئے کہ طاقت کے ذریعے اسے بدل دے، اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے اس کی برائی بیان کرے اور اگر ایسا بھی نہ کر سکے تو اپنے دل میں اسے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''

☆......☆......☆......☆......☆

پانچویں ذمہ داری

نام و ناموس رسالت کی حفاظت

وہ ہستی جن کی خاکِ پا کے صدقے کائنات ہست و بود کو وجود عطاء ہوا، جن کے دم قدم سے کائنات کا جمود ٹوٹا، جن کی برکت سے دنیا کے اس چمن میں بہار آئی، جن کے نام سے کل عالم اور اس کا ذرہ ذرہ آشنا اور شناسا ہے، جن کے کردار نے لوگوں کو باکردار بنایا،

جن کی حیات نے اہل ارض و سماء کو ''حیات'' کا صحیح مفہوم سمجھایا، جن کے اخلاق نے اخلاقیات کے باب میں مہارت تامہ رکھنے والوں کو اخلاق کے ایسے نادر نمونے عطاء کیے کہ وہ انگشت بدنداں رہ گئے، جن کے عدل وانصاف کے سامنے نوشیرواں کا عدل وانصاف پیش کرنا خود لفظ عدل کی توہین ہے، جن کی سخاوت کے سامنے حاتم طائی کے قصے بیان کرنا جود وکرم کی تذلیل ہے، جن کی شجاعت و بسالت کے سامنے رستم وسہراب کے افسانے دہرانا انصاف کا خون ہے، جن کی شرم وحیاء کے سامنے کنواری مہ جبینوں کی حیاء بھی ماند پڑ جاتی ہے، جن کے حسن کو دیکھ کر چاند بھی رشک کرتا ہے۔

جن کی برکت سے اللہ نے انسانیت پر رحم فرمایا، جن کی جوتیوں کے طفیل پروردگار عالم نے انسانیت کو اپنے دین و ہدایت اور دولت ایمان کے لئے قبول فرمایا، جن کی خاطر پروردگار عالم نے انسانیت کو اپنی آخری اور لاریب کتاب کی دولت عطاء فرمائی، جن کے ذریعے اللہ نے ہمیں اپنی ذات کی معرفت اور پہچان عطاء فرمائی۔

بھلا اس ذات کے نام وناموس پر کٹ مرنے میں کوئی چیز رکاوٹ بن سکتی ہے؟ بھلا اس ذات کے ایک ایک حکم پر عمل کرنے سے کوئی چیز روک سکتی ہے؟ بھلا اس ذات کے حسین سراپا کو دیکھنے کی تمنا میں اپنی ساری جمع پونجی لٹانے میں کوئی مصلحت حائل ہوسکتی ہے؟ بھلا اس ذات کی عزت وعصمت اور عفت وطہارت پر کسی گستاخ کا حملہ برداشت کیا جاسکتا ہے؟ بھلا اس ذات کی معصومانہ زندگی کے متعلق کسی بدنصیب ومحروم القسمت کی یاوہ گوئی اور دشنام طرازی کو انگیز کیا جاسکتا ہے؟ بھلا اس ذات کے تقدس پر اپنی سینکڑوں جانوں، اپنی اولادوں اور اپنے مال ودولت کو نچھاور کرنے میں دریغ کیا جاسکتا ہے؟

ہرگز نہیں اور ہرگز نہیں، کیونکہ یہ ایک ایسا نقطہ ہے جہاں پہنچ کر انسان کی عقل، قوت عشقیہ کے تابع ہوجاتی ہے، انسان پر اپنے مصلح وپیغمبر اور ہادی برحق ﷺ کی محبت غالب آجاتی ہے اور عقل مغلوب ہوکر ذہن کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ جاتی ہے، یہی وہ چیز ہے جس کا اہل ایمان سے ان الفاظ میں مطالبہ کیا گیا ہے اور عنقریب اس کی وضاحت آئیگی۔ انشاءاللہ۔

''لا یؤمن احد کم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ

و الناس اجمعین" (البخاری:۱۵)

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کی نگاہوں میں اس کے والد، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں''

الغرض! ایک کلمہ گو مسلمان کے اسلام کا تقاضا ہے کہ وہ نام وناموس رسالت کی حفاظت اپنی جان کی حفاظت سے بڑھ کر فریضہ سمجھے، اس لئے کہ پیغمبر اسلام ﷺ اگر مسلمانوں کو کوئی کام کرنے کا حکم دیں تو مسلمانوں کو اس کی تعمیل و تکمیل کرنے یا نہ کرنے کا اختیار نہیں رہتا، جب کہ انسان اپنے ضمیر کی آواز کو ٹال سکتا ہے اور اس کی تعمیل و تکمیل میں اسے اپنے اوپر مکمل اختیار ہوتا ہے، شاید یہی وہ چیز ہے جس کا ذکر اس آیت مبارکہ میں کیا گیا ہے۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ"

(الاحزاب:٦)

''نبی مکرم ﷺ کو مسلمانوں کی جانوں پر مسلمانوں سے بھی زیادہ حق ہے اور نبی ﷺ کی ازواج مطہرات، امت کی مائیں ہیں''

اس سلسلے میں قرآن کریم نے اہل ایمان پر کچھ ذمہ داریاں عائد کی ہیں، جنہیں ذیل میں اختصار کے ساتھ درج کیا جارہا ہے۔

سب سے زیادہ محبت

دنیا میں ایک انسان دوسرے انسان سے اگر محبت کرتا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ، غرض اور لالچ ہوتی ہے جس کی وہ تکمیل کرنا اپنے جذبات کا حق سمجھتا ہے، بے لوث اور بے غرض محبت کرنے والے اس دنیا میں نہ ہونے کے برابر ہیں، کوئی کسی کے مال پر فریفتہ ہوتا ہے اور کوئی کسی کے حسن کا شکار رہتا ہے، کوئی کسی کے منصب وعہدہ سے مرعوب ہوتا ہے اور کوئی کسی کے کمال پر اس کا گرویدہ ہوجاتا ہے، چونکہ یہ ساری چیزیں فانی ہیں اس لئے ان چیزوں کے ختم ہوجانے سے محبت بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتی ہے، جس کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ دعویٰ محبت الاپنے والا ان چیزوں سے محبت کرتا ہے جس سے اس کے گمان کے مطابق

اس کا ''مطلوب'' لیس ہوتا ہے، یہ کتنی بڑی بیوقوفی ہے کہ ذریعہ محبت ہی اصل محبوب بن چکا ہے اور لوگ اسی میں اپنی جوانی، صحت وتندرستی اور اپنی تمام تر طاقتیں داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں۔

آیئے! آپکو محبت کا ایسا راستہ دکھائیں جس میں کوئی موڑ نہ ہو، جو منزل مقصود تک بآسانی پہنچا سکے اور جو ہر کسی قسم کی غرض اور لالچ سے پاک ہو، یہ وہ محبت ہے جو پروردگار عالم اور سرور کون ومکان ﷺ کسی انسان سے کرتے ہیں اور انسان سے اسی کا تقاضا کرتے ہیں تاکہ انسان اپنے جذبات کو ایک جائز طریقے سے تسکین پہنچا سکے، اور صرف تقاضا ہی نہیں بلکہ شدید تقاضا کرتے ہوئے والدین، اولاد اور کاروبار تک کی محبت کو پسِ پشت ڈالنے کا مطالبہ کرتے ہیں چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

''اے حبیب ﷺ! آپ فرمادیجئے کہ اگر تمہارے والدین، بیٹے، بھائی، بیویاں، برادری اور وہ مال ودولت جو تم کماتے ہو، وہ تجارت جس میں نقصان ہونے سے تم ہمیشہ ڈرتے ہو اور وہ کوٹھیاں جو تمہاری خواہش کے مطابق ہوں، اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور راہ خدا میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر اس وقت کا انتظار کرو جب اللہ کا حکم آپہنچے گا، اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا''

(التوبہ:۲۴)

اسی طرح خود جناب رسول اللہ ﷺ نے بھی اس چیز کی بہت تاکید فرمائی ہے، ارشاد ہے

''والذی نفسی بیدہ لایؤمن احد کم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ وفی روایۃ اخری بزیادۃ و الناس اجمعین'' (البخاری:۱۴،۱۵)

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ تم میں سے کسی شخص کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کی نگاہوں میں اس کے والد، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں''

شاید کسی کو اس پر اعتراض ہو کہ پیغمبر اسلام ﷺ (العیاذ باللہ) ڈرا دھمکا کر لوگوں کو زبردستی اپنے سے محبت کرنے پر مجبور کر رہے ہیں اور بصورت دیگر انہیں یہ دھمکی دیتے ہیں کہ ان کا ایمان ہی مکمل نہ ہوگا، حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی انسان اس بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ فلاں سے محبت ضرور کرے کیونکہ محبت کا تعلق تو انسان کے دل سے ہوتا ہے اور اس پر کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا، پھر اسلام کے داعیٔ اول اور ہدایت ربانی کے علمبردار جناب رسول اللہ ﷺ نے یہ بات کیوں فرمائی؟

راقم الحروف اس کے تحقیقی جواب سے تو ناواقف ہے کیونکہ تحقیق اکابر اہل تحقیق کا کام ہے اور یہ ناکارہ اس کوچہ سے کبھی نہیں گذرا، پھر ان سطور کی تحریر کے وقت ہی یہ سوال ذہن میں ابھرا ہے، جسے شاید اس سے پہلے کسی نے اٹھایا بھی نہ ہو، اسلئے تحقیقی جواب کو ایک طرف رکھ کر اپنے مذاق کے مطابق اس کا جواب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ بظاہر اس شدت میں بھی اہل اسلام وایمان کے لئے شفقت ورحمت نبوی کی ایک بہت بڑی جھلک پائی جاتی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ اور اس کا پیغمبر چاہتے ہیں کہ انسانیت کا ایک ایک فرد ناجی ہو کر جنت کا مستحق بن جائے اور عذاب جہنم سے محفوظ ہو جائے، ابدی نعمتوں سے مستفید ہوتا رہے اور ہمیشہ کے مختلف النوع عذاب سہنے سے بچ جائے، چونکہ رسالتمآب ﷺ بہت پہلے یہ ضابطہ بیان فرما چکے تھے۔

"المرء مع من احب"

"انسان قیامت کے دن اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا تھا"

اس لئے ضروری ہوا کہ اہل ایمان سے اس ضابطہ پر عمل کروایا جائے تاکہ اللہ ورسول ہر مسلمان کے محبوب بن جائیں، جب وہ محبوب بن جائیں گے تو ان کی معیت وزیارت نصیب ہو جائے گی اور یہ بات طے شدہ ہے کہ جنت کو تو سجایا ہی ان کے لئے گیا ہے جن کے نام کو جزوِ کلمہ خود پروردگار عالم نے قرار دیا ہے اس لئے جب وہ جنت میں جائیں گے تو ان سے محبت کرنے والوں کو بھی ان کے طفیل جنت میں داخلہ نصیب ہو ہی جائیگا۔

اس حکمت کے پیش نظر اہل ایمان کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے پیغمبر سے ایسی پکی سچی اور

مضبوط ترین محبت کریں جس میں کسی دوسرے کی محبت رکاوٹ نہ بن سکے، مال ومنال، والد اور مولود، جائیداد اور تجارت کی محبت اس محبت کے سامنے غبارِ راہ کی حیثیت رکھتی ہو اور اس ایک محبت پر ہر قسم کی محبت کو قربان کرنے کا جذبہ اس میں پوری طرح موجزن ہو۔

یہ مسئلہ اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ قرآن کریم ''جو جذبات سے مغلوب ہوئے بغیر حقائق و واقعات کو صحیح تسلسل کے ساتھ دہرانے کے لئے تمام آسمانی کتابوں میں اپنی ایک منفرد شناخت رکھتا ہے'' اس سلسلے میں ایک قدم آگے بڑھ کر کہتا ہے۔

''اے حبیب ﷺ! آپکے پروردگار کی قسم! یہ اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے آپس کے اختلافات میں آپ کو ثالث اور آپکے فیصلے کو مکمل طور پر دل و جان سے تسلیم نہ کرلیں''

(النساء: ۶۵)

خلاصۂ کلام یہ کہ ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس ہستی سے اپنے دل و جان سے محبت وعقیدت کا تعلق رکھے جس کی بدولت اسے ایمان جیسی عظیم نعمت حاصل ہوئی اور اس سلسلے میں وہ کسی کی محبت کو بھی خاطر میں نہ لائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے حبیب ﷺ سے ایسی ہی محبت عطاء فرمائے۔ آمین۔

بے ادبی کے الفاظ سے بھی پرہیز

رسالتمآب ﷺ کا جو مقام ومرتبہ اللہ کی نگاہوں میں ہے اور جس کی وجہ سے انہیں محبوب رکھنا اور ان کے نام وناموس کی حفاظت کرنا اہل ایمان کی ذمہ داری قرار پاتا ہے، اس کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بارگاہ رسالت کے آداب بڑی تفصیل سے بتائے ہیں اور انتہائی پرشکوہ الفاظ میں ان کی اہمیت واضح فرمائی ہے۔

چنانچہ ایک طرف تو مسلمانوں کو ان کی اطاعت واتباع کا حکم دیا گیا ہے اور دوسری طرف اس بات کی وضاحت بھی فرمائی گئی ہے کہ رسالت مآب ﷺ کی شان میں گستاخی کرنا تو بڑی دور کی بات ہے، ان کے سامنے بلند آواز سے بات کرنا بھی منع ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ" (الحجرات: ۲)

"اے ایمان والو! نبی ﷺ کی آواز پر اپنی آوازوں کو بلند نہ کیا کرو، اور ان سے بآواز بلند اس طرح باتیں مت کیا کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں احساس بھی نہ ہو سکے"

بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر قرآن کریم اہل ایمان کو آداب سمجھاتے ہوئے ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ تم لوگ آپس میں جس طرح ایکدوسرے کو اس کا نام لیکر بلا لیتے ہو، پیغمبر اسلام ﷺ کو اس طرح نام لیکر مت پکارا کرو، کیونکہ یہ ان کی بے ادبی ہے، اس سلسلے میں تمہارے لئے پروردگار عالم کا طریقہ کلام بہترین رہنما ہے کہ اس نے تیس پاروں کی اس ضخیم کتاب میں صرف چار مرتبہ اپنے محبوب کا عظیم ترین نام "محمد ﷺ اور دوسرا اہم ترین نام "احمد ﷺ" صرف ایک مرتبہ ذکر کیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے۔

"لَاتَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضاً"

(النور:۶۳)

"پیغمبر اسلام ﷺ کو اس طرح مت پکارو، جیسے آپس میں ایکدوسرے کو پکارتے ہو"

بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر قرآن کریم اہل ایمان سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے یا کسی اور غرض سے ایسے الفاظ استعمال کرنے سے انتہائی احتراز کرنا چاہیے جو ذومعنی ہوں یا ان میں کسی بھی پہلو سے بے ادبی اور گستاخی کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو، مثلاً عربی زبان میں کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے "راعنا" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کا معنی ہے ہماری بھی رعایت فرمائیے۔ تاہم اسی لفظ کو ذرا سا

کھینچ کر پڑھا جائے تو اس کا معنی بگڑ کر ''چرواہا'' بن جاتا ہے اور اس لفظ کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ اے ہمارے چرواہے! ہماری بات سن، چونکہ یہ ذومعنی لفظ تھا اور یہودی اس لفظ کو استعمال کرتے تھے، جن کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی اس لفظ کو اپنی زبانوں پر لانے لگے تھے، پروردگار عالم نے فوراً قرآن کریم کی آیت بنا کر نازل فرمادی۔

''یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا'' (البقرہ:۱۰۴)

''اے اہل ایمان! راعنا کا لفظ مت استعمال کیا کرو، بلکہ اس کی جگہ ''انظرنا'' کا لفظ استعمال کیا کرو، اور اچھی طرح یہ بات سن لو''

ان تمام تفصیلات کو سامنے رکھ کر اب اس نکتے پر غور فرمائیے کہ جب پروردگار عالم کو یہ بات گوارا نہیں ہے کہ کوئی مسلمان، حضور نبی مکرم، سرور دو عالم ﷺ کو ان کا نام لیکر مخاطب کرے، جب پروردگار عالم کو یہی بات پسند نہیں ہے کہ سرور کون و مکاں ﷺ کی آواز پر آواز کو بلند کیا جائے، جب پروردگار عالم کو یہی بات ناگوار ہے کہ کوئی حبیب کبریا ﷺ کے لئے ذومعنی الفاظ استعمال کرے تو خود سوچئے کہ پروردگار عالم ان کی گستاخی اور بے ادبی کو کسی صورت برداشت کرے گا؟ کیا اس گستاخ اور بے ادب و بدنصیب کو حوض کوثر سے جام نصیب ہو سکے گا؟ کیا وہ سرور کونین ﷺ کے رخ تاباں کی زیارت سے شادکام ہو سکے گا؟ کیا وہ شفیع الانبیاء ﷺ کی سفارش سے بہرہ ور ہونے کا مستحق ہے؟ کیا اس کے پاس دولت ایمان کا کوئی شمہ بھی ہوگا؟

آج ایمان کے تمام ڈاکو اس بات پر متفق ہو چکے ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں پیغمبر اسلام ﷺ کی محبت کی جو شمع روشن ہے، اسے کسی طرح بجھا دیا جائے، عظمت مصطفیٰ ﷺ کے اقرار کا جو شجر سایہ دار ہے اس کی جڑوں کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے اور شان مصطفیٰ ﷺ پر اصرار کا جو سیلاب دلوں میں موجزن ہے، اسے ریت سے بھر کر پاٹ دیا جائے، لیکن وہ بیچارے ہمیشہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ہر دور میں غازی علم الدین شہید ہوتے ہیں اور وہ بدنصیب اس حقیقت کو فراموش کر کے اپنے جذبہ بغض و عناد کو مختلف طریقوں سے تسکین

دینے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی توہین آمیز لٹریچر و رسالوں کی صورت میں اور کبھی گستاخانہ خاکوں کی صورت میں، کبھی لڑائی جھگڑوں سے بھرپور مناظروں کی صورت میں اور کبھی نام نہاد تحقیق اور اس کے نتیجے میں پیدا کئے جانے والے اعتراضات کی صورت میں لیکن اسی وقت کوئی شہباز جھپٹتا ہے، درود و سلام کا ترانہ بلند کرتا ہے اور مجرم کو اس کے منطقی انجام سے دوچار کر کے خود تختہ دار کو قبول کر لیتا ہے، اسی وقت کوئی جانباز آگے بڑھتا ہے اور اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے درود و سلام کا ترانہ بلند کرتے ہوئے اپنے آقا و مولیٰ ﷺ کے قدوم میمنت لزوم سے جا کر لپٹ جاتا ہے اور اسے اپنے لئے نہایت عظیم سعادت سمجھتا ہے، لوگ اسے جنون سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی نظر میں عقل کا اس سے عمدہ فیصلہ کوئی دوسرا نہیں ہوتا، لوگ اسے اقرارِ قتل سے روکتے ہیں اور اس کی نظر میں وہ اس کی متاعِ حیات ہوتی ہے، یوں اس کا انکار ان کے مسلسل اصرار پر غالب آجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو عظمت مصطفیٰ ﷺ کی اہمیت اپنے دلوں میں پیدا کرنے اور پروان چڑھانے کی صلاحیت مرحمت فرمائے۔ آمین



درود و سلام

رحمت کا خزینہ، عافیت کا گنجینہ، سلامتی کا دفینہ اور کروبیت کا سفینہ تلاشِ بسیار اور جستجوِ طویل کے بعد اگر کوئی چیز سمجھ میں آتی ہے تو وہ نبی رحمت، سراپا شفقت، پیکر سخاوت، مجسم شجاعت، حضور نبی مکرم، سرور دو عالم ﷺ کے دامن مطہر و منور کے ساتھ التزام و تعلق ہے، اس دامن مبارک میں وہ وسعت ہے جو پورے عالم میں نہیں ہے، رحمت یہیں سے تقسیم ہوتی ہے، عافیت کی دعائیں یہیں سے ملتی ہیں، سلامتی کی قدر و قیمت یہیں آکر پتہ چلتی ہے، کروبیت اور ملکیت کا لباس انسان کو یہیں آکر حاصل ہوتا ہے، آسان لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ دین و دنیا کی ساری کامیابیاں اسی دامن سے وابستہ ہو کر نصیب ہوتی ہیں، جو شخص اس دامن سے وابستہ ہو گیا، اس کا بیڑہ پار ہو گیا اور جو شخص اس دامن سے کٹ گیا، اس کا بیڑہ غرق ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ اظہار محبت و تعلق کسی ایک صورت میں بند نہیں، محبّ اپنے محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوتا ہے اور اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا، گو کہ عشق مجازی کی تحسین اور حوصلہ افزائی نہیں کی جا سکتی لیکن عشق نبوت کے گرفتار پروانوں اور دیوانوں نے اپنی جان، مال، صحت، جوانی، اولاد، ازواج، گھربار غرض! ہر چیز اپنے محبوب ﷺ کے قدموں پر نچھاور کر کے اپنے لئے سعادت اور فوز وفلاح کے فیصلے کروا لئے اور ایک ہم بدنصیب ہیں کہ اپنے حبیب ﷺ کے رخِ تاباں کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکے، ان کی بابرکت مجلس و ہم نشینی کا ایک لمحہ کے لئے بھی شرف حاصل کرنے سے محروم رہے، ان کی خدمت کا شوق وحسرت اپنے دل میں لئے ہوئے ہی دنیا سے رخصت ہو جائیں گے، ان کی جوتیوں میں بیٹھنے کا ارمان دل ہی میں لئے ہوئے یہاں سے کوچ کر جائیں گے، ان سے اپنے اور اپنی نسل کے لئے دعاء کرنے کی تمنا لئے ہوئے ہی دار آخرت کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔

اے کاش! میں ان کے پاؤں دھو کر پی سکتا، اے کاش! میں ان کے رخِ روشن کی زیارت کر کے اپنے ایمان کا برتن روشن کر سکتا، اے کاش! کائنات کے خزانے میری ملکیت ہوتے، وہ مجھے حکم دیتے جاتے اور میں دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کر لٹاتا جاتا، اے کاش! زمام کائنات میرے ہاتھ میں ہوتی، وہ مجھے حکم دیتے جاتے اور میں ان کی منشاء کی تعمیل کرتا جاتا، لیکن افسوس صد افسوس! ایسا نہ ہو سکا اور ایسا ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ کہاں مجھ سا بدنصیب اور کہاں ان کا مقام ومرتبہ؟ کہاں ادب سے محروم ایک فقیر بے نوا اور کہاں ادب کا معلم اول؟ کہاں علم کی ابجد اور نام سے بھی نا آشنا ایک حقیر ذرہ اور کہاں دنیا کی درسگاہیں اور کتابیں دھو دینے والا؟ کہاں اخلاق سے بے بہرہ اور عاری ایک قطرۂ بے حیثیت اور کہاں اخلاق عظیمہ پر سرفراز شخصیت؟

تاہم اس سب کے باوجود ایک احساس جب قلب وجگر میں اترتا ہے تو اس کی شیرینی اور مٹھاس مجھ جیسے بے حس کو بھی شیریں کر جاتی ہے اور یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کے ہر فرد کی اس اہم ترین خواہش کی تکمیل پروردگار عالم کو بھی ضروری محسوس ہوتی ہے، جب

ہی تو اس نے ''درود'' کی صورت میں اظہار محبت کا ایک طریقہ نہ صرف یہ کہ مقرر کر دیا بلکہ خود اس میں اپنا حصہ بھی ڈالا کیونکہ خود اسے بھی اپنے بندے سے محبت ہے۔

اس موقع پر ایک نکتہ ذہن میں آتا ہے جو یقیناً اس تذکرہ خیر ہی کی برکت ہے کہ محبوبِ کائنات ﷺ کی ہستی ایسی کامل و مکمل ذات ہے جن سے صرف انسانیت ہی نہیں بلکہ خالقِ انسانیت بھی محبت کرتا ہے، ظاہر ہے کہ خالق خالق ہے اور مخلوق مخلوق، اور یہ بھی مسلم ہے کہ مخلوق جتنی بھی ترقی کر لے وہ خالق کبھی نہیں بن سکتی اور خالق جتنا بھی نیچے آ جائے مخلوق سے بہر حال عالی قدر و بلند مرتبت ہوگا۔

اس اعتبار سے محبوب کائنات ﷺ سے اظہار محبت کا طریقہ بھی جدا ہونا چاہئے اور خالق کو اپنے شایان شان اور مخلوق کو اپنی حیثیت کے مطابق اظہار محبت کرنا چاہئے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ خالق اپنے محبوب سے جس انداز میں اظہار محبت خود کرتا ہے، اپنے بندوں کو بھی وہی طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے۔

''اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً'' (الاحزاب:۵۶)

آزاد ترجمانی کرتے ہوئے اس آیت کا مفہوم یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اے اہل ایمان! میں نے اپنے حبیب ﷺ سے اظہار محبت کے لئے ''صلوۃ'' کا طریقہ اختیار کیا ہے، اپنے معصوم فرشتوں کو بھی اسی طریقے پر قائم رہنے کا حکم دیا ہے اور اب تمہیں بھی یہی حکم دیا جارہا ہے کہ اس طریقے کو اختیار کر کے محبوبِ کائنات و خالق کائنات ﷺ سے اپنی محبت کا اظہار کرو۔

شاید اس طویل تمہید کے بعد یہ بات سمجھ میں آگئی ہو کہ درود شریف کس قدر عظیم نعمت ہے اور اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں کثرت سے درود و سلام کے نذرانے اور ترانے پیش کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

قریبی رشتہ داروں سے محبت

ہمیں روزمرہ کی زندگی میں عام طور پر یہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ جو شخص ہماری اولاد

اور دیگر اہل خانہ سے محبت کرتا ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں اس سے محبت ہو جاتی ہے اور ہم اس کا احترام و اکرام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے اہل خانہ سے محبت کرنے والا ہماری نگاہوں میں قابل احترام ٹھہرتا ہے، سوچنے کی بات ہے کہ جب پیغمبر اسلام ﷺ کے اہل خانہ سے محبت کی جائے گی تو ان کی نگاہوں میں ہمارا قابل احترام ہونا کیونکرنا قابل فہم ہو؟ اوران کی بارگاہ میں ہمیں رتبہ مل جانا کیونکرنا قابل یقین ہو؟

اس بات پر یقین کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے اہل خانہ (جسے عربی میں ''اہل بیت'' کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے) سے محبت کا اظہار ہمارے لاشعور میں اس طرح بٹھا دیا گیا ہے کہ نماز کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ قعدہ اخیرہ میں دوزانو بیٹھ کر یوں نہ کہہ لیا جائے۔

''اللھم صل علی محمد و علی آل محمد''

اور یہی وہ چیز ہے جس کا مطالبہ خود قرآن کریم میں بھی اہل ایمان سے کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

''قُل لآ اَسئَلُکُمْ عَلَیهِ اجرًا اِلاَّ الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُربیٰ''

(الشوریٰ:۲۳)

''اے حبیب ﷺ! آپ فرمادیجئے کہ میں تم سے اپنی دعوت و تبلیغ پر کوئی اجرت نہیں مانگتا لیکن میرے قریبی رشتہ داروں سے دوستی کا معاملہ تو کرو''

تاہم یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اہل بیت سے اظہارِ محبت کا وہ طریقہ ''جس سے انہیں بھی کچھ فائدہ ہو سکے اور ہمارے لئے بھی وہ ذریعہ نجات بن سکے'' یہ ہے کہ نفلی عبادات اور صدقہ و خیرات کر کے بارگاہ ایزدی میں یوں عرض کرے۔

''یا اللہ! میرے اس مختصر عمل کو قبول فرما اور اس کا جو ثواب مقرر فرما رکھا ہے، وہ مجھ گنہگار کی طرف سے تحفہ کے طور پر جناب رسول اللہ ﷺ اور آپکے اہل بیت اطہار (بنات طیبات اور ازواج مطہرات) رضوان اللہ علی جمیعھم کی خدمت میں پیش فرما دے، ان کے خدام میں ہمارا

بھی شمار فرمالے اوران کی کامل محبت اور مکمل اتباع نصیب فرما''

تبصرہ

یہ ہے اہل ایمان کی وہ پانچویں ذمہ داری جس کا قرآن کریم اہل ایمان سے مطالبہ کرتا ہے اوراس سلسلے میں ایک ایک ادب بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے تاکہ اہل ایمان ان تمام آداب کی رعایت کریں کیونکہ مقام، مقام ادب ہے، یہاں نام لیکر بات کرنا تو بڑی دور کی بات ہے، اونچی آواز میں گفتگو کرنے کی بھی اجازت نہیں، بصورت دیگر اعمال ضائع ہوجانے کا خطرہ ہروقت منڈلاتا رہے گا۔

راقم الحروف کواس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں محسوس ہوتی کہ بحمد اللہ اس گئے گذرے دور میں بھی مسلمان اتنا بے غیرت اور بے ضمیر نہیں ہوا کہ نام و ناموس رسالت کی حفاظت کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے سے دریغ کرے، ہر مسلمان کے ضمیر میں کم ازکم اتنی زندگی تو موجود ہے کہ وہ نازک سے نازک مرحلے پر بھی شمع رسالت کے پروانوں میں شامل ہونے سے کبھی نہیں گھبراتا، وہ غازی علم الدین شہید ہو کہ جس نے گستاخِ زمانہ راجپال مردود کو جہنم واصل کرکے شربت وصال کا بھرا ہوا پیالہ نوش کیا یا غازی عامر عبدالرحمٰن چیمہ کہ جس نے ۲۰۰۶ء میں ڈنمارک کی گستاخانہ حرکت پر (جواس نے اہل ایمان کی پیغمبر اسلام ﷺ سے عقیدت ومحبت کا امتحان لینے کے لئے گستاخانہ خاکوں کی صورت میں کی تھی) اپنے جذبات سے مشتعل ہوکر تختہ دار ورسن کو قبول کرلیا اور دنیاء کفر کو پیغام دے گیا کہ مسلمان سب کچھ برداشت کرسکتا ہے لیکن اپنے پیغمبر ﷺ کے نام وناموس پر ھرزہ سرائی اور یاوہ گوئی کو وہ کسی صورت برداشت نہیں کرسکتا، اس سے اس کے سینے میں جولاوا ابلتا رہتا ہے، کبھی نہ کبھی آتش فشاں بن کر پھٹ پڑتا ہے اور گستاخوں کو ان کی گستاخی کی قرار واقعی سزا سے دوچار کردیتا ہے۔

رب ذوالجلال سے دعاء کرنی چاہیے کہ وہ اہل اسلام کے اس جذبہ محبت کو قبول فرمائے، اس میں مزید نکھار اور جلاء پیدا فرمائے اور یہی غیرت ہمیں سیرت وسنت مصطفیٰ ﷺ

کے سلسلے میں بھی ارزانی کے ساتھ مرحمت فرمادے۔آمین

چھٹی ذمہ داری

صفات عبادالرحمٰن

فرض نماز ''خواہ دو رکعت والی ہو یا تین اور چار رکعت والی'' کی ہر رکعت میں پڑھی جانے والی سورہ فاتحہ یوں تو ہر لحاظ سے انتہائی اہم ہے لیکن اس کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں صراط مستقیم کی طلب اور دعا پائی جاتی ہے، صراط مستقیم کیا چیز ہے؟ اس کی وضاحت بھی اسی سورہ مبارکہ کی اگلی آیت سے ہو جاتی ہے اور ہر انسان کو یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ جن راہوں سے اللہ کے انعام یافتہ، نیک، صالح اور خاص بندے گذر کر اپنے نقش پا چھوڑ گئے، انہی نقوش پر چلتے ہوئے منزل مقصود ''جنت'' تک پہنچ جانا صراط مستقیم کا حقیقی مفہوم ہے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اللہ کے انعام یافتہ بندے کون ہیں؟ وہ کون لوگ ہیں جو اللہ کے خاص بندوں میں شمار ہوتے ہیں؟ اور وہ کون لوگ ہیں جن کے نقشِ پا کو اختیار کر کے ہم اپنی آخرت کو سنوار سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں اتنی بات تو واضح ہے کہ سورۂ فاتحہ میں ہمیں ان افراد کے بارے کچھ نہیں بتایا گیا اور اس سوال کا جواب ہم سورۂ فاتحہ میں نہیں پاتے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ پورا قرآن کریم اس سوال کے جواب میں خاموش ہے، قرآن کریم کی مختلف آیات ہمیں اس سوال کے جواب سے روشناس کراتی ہیں اور پس منظر میں رہتے ہوئے ہمارے اذہان کو اس سے مانوس کرنے اور اسے اختیار کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔

ذیل میں پہلے اس مضمون کی آیات درج کی جاتی ہیں، اس کے بعد ان پر تبصرہ کیا جائیگا۔

چنانچہ سورۂ مبارکہ نساء کی آیت نمبر ۶۹ میں ارشاد ربانی ہے۔

''جو لوگ اللہ و رسول کی اطاعت کرتے ہیں، وہ ان لوگوں کی معیت
میں ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا خصوصی انعام فرمایا ہے یعنی

انبیاء کرام علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین اور ان کی رفاقت کیا خوب چیز ہے" (النساء:۶۹)

اسی طرح سورۂ مبارکہ توبہ کی آیت نمبر ۱۱۲ میں ارشاد ربانی ہے۔

"وہ (مسلمان) اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والے، اللہ کی بندگی کرنے والے، اللہ کے شکر گذار و ثناء خواں، روزہ دار، رکوع و سجود کرنے والے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے اور اللہ کی مقرر کردہ حدود کی پابندی کرنے والے ہوتے ہیں" (التوبہ:۱۱۲)

اسی طرح سورۂ مبارکہ احزاب کی آیت نمبر ۲۵ میں ارشاد ربانی ہے۔

"بیشک مسلمان مرد و عورت، اہل ایمان مرد و عورت، بندگی رب کرنے والے مرد و عورت، سچ بولنے والے مرد و عورت، روزہ رکھنے والے مرد و عورت، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد و عورت اور کثرت سے ذکر الٰہی کرنے والے مرد و عورت کے لئے اللہ نے بخشش اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے"

اسی طرح سورۂ مبارکہ فرقان کے آخری رکوع میں اپنے مخصوص بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

"رحمٰن کے بندے تو وہ ہوتے ہیں جو زمین پر وقار سے چلتے ہیں، جب جاہل لوگ ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ سلامتی کی بات کہہ دیتے ہیں، جو ساری رات اپنے پروردگار کے سامنے سجود و قیام میں گذار دیتے ہیں، جو دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کے عذاب کو دور فرما دے، جہنم کا عذاب تو چمٹ جانے والا ہے، خود جہنم ٹھہرنے اور رکنے کی بہت بری جگہ ہے، جو اپنے خرچ میں نہ تو حد سے زیادہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بے جا تنگی کرتے ہیں بلکہ ان دونوں کے درمیان اعتدال کا راستہ اختیار

کرتے ہیں، جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے، اللہ نے جسے قتل کرنا حرام قرار دیدیا ہے، اسے ناحق قتل نہیں کرتے اور بدکاری بھی نہیں کرتے، جو شخص یہ کام کرے گا وہ سزا سے دوچار ہوگا، قیامت کے دن اسے دگنا عذاب دیا جائیگا اور وہ اس میں ذلت کے ساتھ ہمیشہ رہے گا، ہاں! اگر کوئی توبہ کر کے ایمان لے آئے اور نیک اعمال کرنے لگے تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیا جائیگا کیونکہ اللہ تو ہے ہی بخشنے والا مہربان۔ اور جو شخص توبہ کر کے نیک اعمال بجالانے لگے، گویا وہ اللہ کی طرف واپس لوٹ آیا، اسی طرح وہ لوگ (بھی اللہ کے مخصوص بندے ہیں) جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے، جب کسی بیہودہ جگہ یا چیز پر ان کا گذر ہوتا ہے تو شرافت کا دامن تھامے گذر جاتے ہیں، جب ان کے سامنے ان کے رب کی آیات نصیحت کے لئے بیان کی جائیں تو اندھے بہرے بن کر نہیں گذر جاتے اور وہ لوگ جو یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطاء فرما اور ہمیں متقیوں کا پیشوا بنا، یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کی ثابت قدمی کیوجہ سے جزاء کے طور پر بالاخانے دیئے جائیں گے اور فرشتے ان کے لئے دعائیں کرتے ہوئے اور انہیں سلام کہتے ہوئے لینے آئیں گے'' (الفرقان: آخری رکوع)

اللہ کے مخصوص بندوں کی یہ وہ صفات ہیں جن کی نشو ونما اور تخلیق ہر مسلمان اور مدعی ایمان سے مطلوب ہے اور ہر مسلمان سے بجا طور پر یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اندر ان صفات کو پیدا کرے اور حتی الامکان اپنے آپکو ان سے مزین کرنے کی کوشش کرے۔

یاد کی آسانی کے لئے ہم ان صفات کو نمبر وار ترتیب سے ذکر کئے دیتے ہیں۔

۱۔ گناہوں سے توبہ کرنا۔

۲۔ صرف ایک اللہ کی عبادت کرنا۔
۳۔ شکر وحمد الٰہی میں مصروف رہنا۔
۴۔ پابند صوم وصلوٰۃ ہونا۔
۵۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہنا۔
۶۔ حدود اللہ سے تجاوز نہ کرنا۔
۷۔ اسلام کی خوبیاں پیدا کرنا۔
۸۔ ایمان کی تعریف پیدا کرنا۔
۹۔ سچ بولنے کی عادت ڈالنا۔
۱۰۔ مصائب پر صبر کرنا۔
۱۱۔ عاجزی وانکساری کرنا۔
۱۲۔ صدقہ وخیرات کرنا۔
۱۳۔ شرمگاہ کی حفاظت کرنا۔
۱۴۔ کثرت سے ذکر الٰہی کرنا۔
۱۵۔ زمین پر وقار سے چلنا۔
۱۶۔ جہلاء سے بھی سلامتی کی بات کہنا۔
۱۷۔ رات کو اپنے رب سے راز و نیاز کرنا۔
۱۸۔ جہنم سے پناہ مانگنا۔
۱۹۔ اسراف اور بے جا تنگی سے بچ کر میانہ روی اختیار کرنا۔
۲۰۔ قتل ناحق سے بچنا۔
۲۱۔ بدکاری سے بچنا۔
۲۲۔ جھوٹی گواہی دینے سے بچنا۔
۲۳۔ شرافت کا دامن تھامے رہنا۔
۲۴۔ آیات الٰہیہ میں تدبر و تفکر کرنا۔
۲۵۔ اپنے لئے دعائیں کرنا۔

تبصرہ

قارئین کرام! آپ نے عباد الرحمٰن کی یہ پچیس صفات ملاحظہ فرمائیں، ان میں سے بہت سی صفات تو وہ ہیں جن پر گذشتہ صفحات میں کچھ نہ کچھ لکھا گیا ہے اور بعض پر کچھ نہیں لکھا جاسکا، تاہم اس اجمالی تذکرہ پر اکتفاء کرتے ہوئے اتنا ضرور عرض کرنا ہے کہ اگر ہم وہ صراط مستقیم حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کی دعا نماز کی ہر رکعت میں مانگی جاتی ہے تو ہمیں اپنے اندر ان صفات کو پیدا کرنا ہوگا۔

اے کاش! ہمارے معاشرے کے ایک فرد میں یہ خوبیاں پیدا ہو جائیں، تا کہ ہمارے اس معاشرے پر فرشتے بھی رشک کرنے لگیں، اے کاش! ہم غفلت کے پردے اپنی آنکھوں سے ہٹا کر وہ بابرکت نظارہ دوبارہ دیکھ سکیں جسے دیکھنے کے لئے آسمان سے فرشتے اتر اتر کر زمین پر آیا کرتے تھے۔

نوٹ: ریڈیو کی وہ تحریر جو اس کتاب کا نقشِ اوّل ہے، اگلے صفحات میں وہ پیش کی جارہی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

نحمدہ نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم امابعد فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم بسم الله الرحمن الرحیم یایھا الذین امنو امنوا بالله و رسوله و الکتب الذی نزل علی رسولہ و الکتب الذی انزل من قبل صدق اللہ العظیم۔

یہ ایک واضح سی بات ہے کہ انسان زندگی کے جس شعبے سے بھی وابستہ ہو اور جس ادارے سے بھی اس کی معاشی زندگی کا تعلق ہو، وہ اس شعبے اور ادارے کے قوانین اور اصول وضوابط کا پابند ہوتا ہے، اس ادارے کی طرف سے لاگو کی جانے والی ذمہ داریاں اسے نبھانا ہوتی ہیں اور اپنے فرائض کی تکمیل اس کے ذمے ضروری سمجھی جاتی ہے، اگر کوئی شخص کسی ادارے سے وابستہ ہوتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں دیانت داری اور ایمانداری کے ساتھ نبھانے میں کسی قسم کی کوتاہی کرے تو اسے پہلے تنبیہ کی جاتی ہے اور بار بار متوجہ کرنے کے باوجود اگر وہ اپنی ذمہ داریاں صحیح طرح پوری نہ کرے تو اسے اس ادارے سے فارغ کردیا جاتا ہے۔

بالکل اسی طرح جب ہم نے کلمہ طیبہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھ لیا تو اب، ہم پر کچھ ایسی ذمہ داریاں خود بخود لاگو ہوگئیں جنہیں پورا کرنا ہر اس شخص کی ذمہ داری ہے جس نے یہ کلمہ پڑھا ہے اور ان ذمہ داریوں کی تکمیل کرنے والا ہی اپنے ایمان میں کامل سمجھا جائیگا، اس سلسلے میں آیات قرآنی کی روشنی میں اہل ایمان کی اہم اہم ذمہ داریاں آج کی نشست میں بیان کرنا مقصود ہیں۔

چنانچہ ایک مسلمان کی سب سے پہلی ذمہ داری "جو سورہ مبارکہ نساء کی آیت نمبر ۱۳۶ سے معلوم ہوتی ہے" یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کی جو عظیم ترین نعمت عطاء فرمائی ہے اور جس کے بغیر کوئی نیک عمل مقبول نہیں ہوتا، اپنی جان سے زیادہ اس کی حفاظت کرے اس

لئے کہ جس طرح مال و دولت کو چور اور ڈاکو سے خطرہ ہوتا ہے اسی طرح ایمان پر بھی ڈاکہ پڑنے کا خطرہ ہوتا ہے، جس کے لئے شیطان اپنی تمام تر طاقتوں اور توانائیوں کو استعمال کرتا ہے، اس لئے اس نعمت کی حفاظت ایک مسلمان کی سب سے پہلی ذمہ داری ہے۔

اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا اہم ترین موقع وہ ہوتا ہے جب دنیاوی آرائش و آسائش، کاروباری ترقی اور مقاصد کی تکمیل کے لئے انسان کے ایمان کا سودا کیا جاتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ اپنے آپ کو غیر مسلم لکھوا دو، لکھنے سے تو کچھ نہیں ہوتا، بیرون ملک بھی پہنچ جاؤ گے اور زندگی بھی خوب اچھی بسر ہوگی، اس موقع پر انسان کا اپنے ایمان پر ثابت قدم رہنا اور دنیاوی آرام وراحت کو ٹھوکر مارنا ہی کامیابی کا سب سے بڑا راستہ ہے۔

دوسری اہم ترین ذمہ داری جو اہل ایمان پر عائد ہوتی ہے، وہ ہے جس کی طرف سورۂ مبارکہ انعام کی آیت نمبر ۱۳۸ اور ۱۳۹ میں اشارہ کیا گیا ہے اور سورہ مبارکہ یونس کی آیت نمبر ۵۹ اور سورہ مبارکہ نحل کی آیت نمبر ۱۱۶ میں وضاحت کی گئی ہے کہ کسی چیز کو پوری امت کے لئے حلال وحرام قرار دینے کا اختیار کسی امتی کے پاس نہیں، بلکہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ اللہ نے جس چیز کو حلال قرار دیا ہے اسے دل سے حلال سمجھے، اور جسے حرام قرار دیا ہے اسے دل سے حرام سمجھے، اس میں کسی طرح کی تاویل اور حجت بازی سے کام نہ لے اور اپنی خواہشات کے منہ زور گھوڑے کو لگام ڈال کر رکھے۔

مثلاً اگر قرآن کریم سورہ مبارکہ مائدہ کی آیت نمبر ۹۰ میں شراب کو گندگی قرار دیتے ہوئے اس سے بچنے کی تاکید کرتا ہے تو ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ اسے گندگی سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو اس سے بچائے اور دوستوں کے بہکائے میں آکر اس گندگی کو اپنے حلق سے ہرگز نہ اتارے، اسی طرح اگر قرآن کریم سورۂ مبارکہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۸ میں سود سے بچنے کی تاکید کرتا ہے اور سودی معاملات کو اللہ اور اس کے پیغمبر سے جنگ قرار دیتا ہے تو ایک مسلمان کی شان اور ذمہ داری یہی ہے کہ وہ اس جنگ میں ''جس کا نتیجہ اس کے لئے سوائے ناکامی کے کچھ نہیں'' اپنے آپ کو ملوث نہ کرے اور سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۵ کی روشنی میں سود کو حرام سمجھے اور حتی الامکان اس سے بچے۔

اسی طرح اگر قرآن کریم سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۳۲ میں بدکاری کے قریب جانے سے بھی منع کرتا ہے تو اس کے اسباب سے بھی اپنے آپ کو بچائے اور بدکاری کو حرام سمجھتے ہوئے اپنی جوانی اور عفت وعصمت کی حفاظت کرے کیونکہ جوانی اللہ کی نعمت ہے جسے اللہ کی بغاوت سے بچا کر اس کی عبادت میں استعمال کرنا ہی اس کے حق کی ادائیگی ہے۔

تیسری اہم ذمہ داری جو قرآن کریم اہل ایمان پر عائد کرتا ہے، یہ ہے کہ اسے جو کام کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ان پر پابندی کے ساتھ عمل پیرا رہے اور جن کاموں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے ان سے مکمل طور پر بچتا رہے مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ قرآن کریم اپنے پیروکاروں کو عدل وانصاف کا بھی حکم دیتا ہے، والدین کے ساتھ حسن سلوک، یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں کی خبر گیری، پڑوسیوں کے ساتھ عمدہ تعلقات اور اجنبی مسافروں کے ساتھ تعاون اور ان کی صحیح رہنمائی بھی قرآنی تعلیمات کا حصہ ہے، اسی طرح اللہ کے دیئے ہوئے مال کو اس کی مخلوق پر خرچ کرنا، قرض وامانت کی ادائیگی کا اہتمام کرنا، انسانیت کی خدمت کرنا، مصائب پر صبر کرنا، نعمتوں پر شکر کرنا اور اسباب سے زیادہ رب الاسباب پر بھروسہ کرنا بھی تعلیماتِ قرآنی کا اہم ترین حصہ ہے اور چونکہ ہر مسلمان کو یہ کام کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس لئے ان کی پاسداری کرنا اس کے ذمے ضروری ہے۔

اور جن کاموں سے ایک مسلمان کو روکا گیا ہے ان سے بچنا بھی اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہے مثلاً شرک وبت پرستی، خود پسندی، یتیم کے مال پر ناجائز قبضہ، غیر مسلموں سے ایسی قلبی محبت جس سے دین پر چوٹ پڑتی ہو، جھوٹ، دھوکہ، رشوت اور ناپ تول میں کمی وغیرہ بہت سی چیزوں سے قرآن کریم میں روکا گیا ہے، ان سے رکنا اور بچنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔

چوتھی اہم ذمہ داری جو قرآن کریم اہل ایمان پر عائد کرتا ہے، وہ ہے جس کا تذکرہ سورہ مبارکہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۴ میں کیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جس نے اپنی ساری زندگی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی اچھے کاموں کا حکم اور برے کاموں سے روکنے کے لئے وقف کر رکھی ہو، اس کے لئے تقریر و تحریر، درس وتدریس، تصنیف وتالیف، نشر واشاعت اور ذرائع ابلاغ کو استعمال کرنے

والے بھی اسی ذمہ داری کی تکمیل میں مصروف عمل سمجھے جائیں گے۔

پانچویں اہم ترین ذمہ داری جو اہل ایمان پر عائد کی گئی ہے، یہ ہے کہ ہر مسلمان جناب رسول اللہ ﷺ کے نام و ناموس کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر فریضہ سمجھے، ان کی شان میں ادنیٰ گستاخی سے بھی بچے، ان کے احسانات کا قلبی طور پر معترف وشکرگذار رہے، سورہ مبارکہ شوریٰ کی آیت نمبر۲۳ کے مطابق آپ ﷺ کے قریبی رشتہ داروں مثلاً ازواج مطہرات، بنات طیبات اور سسرالی اعزہ واقرباء سے محبت رکھے، سورۂ مبارکہ احزاب کی آیت نمبر ۵۶ کے مطابق ان پر درود وسلام کے نذرانے پیش کرتا رہے۔

چھٹی اہم ذمہ داری وہ ہے جس کی طرف سورۂ آل عمران کی آیت نمبر۱۹۱ میں توجہ دلائی گئی ہے کہ اس کائنات رنگ و بو میں غور وفکر کر کے اپنے خالق تک رسائی حاصل کرنے کی فکر کرے اور اسے بیکار نہ سمجھے۔

ساتویں ذمہ داری جو اہل ایمان پر عائد کی گئی ہے، وہ ہے جس کی طرف سورہ مبارکہ فرقان کے آخری رکوع میں توجہ دلائی گئی ہے کہ اپنے اندر ان صفات کو پیدا کیا جائے جن سے اللہ کی رحمت و برکت موسلا دھار بارش کی طرح برسنے لگے، ان صفات کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور بولنے چالنے میں وقار اور سکون کا مظاہرہ۔

۲۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے خالق و مالک سے راز و نیاز کی باتیں کرنا۔

۳۔ عذاب جہنم سے حفاظت کی دعا مانگتے رہنا۔

۴۔ میانہ روی اور اعتدال کے ساتھ چلنا۔

۵۔ شرک و بت پرستی سے بچنا۔

۶۔ ناحق قتل سے بچنا۔

۷۔ بدکاری سے اپنے آپ کو مکمل طور پر محفوظ رکھنا۔

۸۔ جھوٹی گواہی سے بچنا۔

۹۔ آیات الٰہیہ میں تفکر و تدبر کرنا۔

۱۰۔ اچھی چیزوں کے حصول کے لئے دعائیں کرنا۔

اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کے ایک ایک فرد میں احساس ذمہ داری پیدا فرمادے اور ہر ایک کو اپنے فرائض کی ادائیگی کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

و آخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین۔

اجازت سے پہلے

آخر میں اس کتاب کے ہر قاری کے نام راقم الحروف کی طرف سے ایک پیغام

قارئین کرام!

اہل ایمان کی وہ ذمہ داریاں جن کا قرآن کریم ان سے مطالبہ کرتا ہے اور جن میں سے کچھ اہم ترین ذمہ داریاں مختصر وضاحت کے ساتھ ان صفحات میں بھی ذکر کی گئیں، ان میں کسی کا اختلاف نہیں، پوری امت کے عوام وخواص کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہر مسلمان ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کا پابند ہے اور اسے ان سے عہدہ برآ ہونا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ مؤلف اس بات کا معترف ہے کہ اس مختصر کتاب میں ان تمام مطالبات اور ذمہ داریوں کا احاطہ نہیں کیا جاسکا جن کا قرآن وحدیث میں اہل ایمان سے مطالبہ کیا گیا ہے۔

اس وقت ملت اسلامیہ کیلئے یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ اختلافی مسائل کو ہوا دیکر ایک مخصوص طبقہ لوگوں میں منافرت اور دشمنی پیدا کر رہا ہے، عوامی مجالس میں علمی مسائل کو زیر بحث لا کر لوگوں کے اذہان کو خلجان میں مبتلا کیا جا رہا ہے، شیعہ سنی سے باہم دست وگریباں ہے، بریلوی، دیوبندی سے چومکھی جنگ لڑ رہا ہے، غیر مقلد الگ اپنی ڈفلی بجا رہے ہیں، دیوبندی بریلوی سے برسرپیکار ہے لیکن افراتفری کی اس جنگ میں یہ سوچنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا کہ اگر دس باتیں اختلافی مسائل سے تعلق رکھنے والی ہیں تو کم از کم پانچ باتیں اتفاقی بھی تو ہوں گی، کیوں نہ پہلے ان پر عمل کرلیا جائے اور اختلافی مسائل میں ہر ایک کو اس کے بزرگوں کی رائے پر عمل کرنے میں آزاد چھوڑ دیا جائے۔

اس سلسلے میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا بیان کردہ یہ اصول عقل کے کس قدر

قریب ہے کہ اپنا مسلک چھوڑو نہیں، دوسروں کا مسلک چھیڑو نہیں۔

مؤلفِ کتاب اپنے ہر قاری سے دست بستہ عرض گذار ہے کہ اختلاف کی گدلی اور غبار آلود فضاء سے نکل کر اتفاق کی صاف ستھری فضا میں جینے کو ترجیح دیجئے، اپنی زندگی کو قرآنی مطالبات کی ادائیگی میں گذارنے کے لئے وقف کر دیجئے، حدیث کو اپنی زندگی کا سرچشمہ بنا لیجئے، حضور نبی مکرم سرور دو عالم ﷺ کی پاکیزہ سیرت کو اپنے لئے آئیڈیل بنا لیجئے اور قرآن و حدیث کی تعلیمات پر عمل کر کے معاشرے کو رشک ملائک بننے کی راہ پر گامزن کیجئے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

ایک پیغام

آیئے! اختلافات کی خلیج کو اتفاق واتحاد کی وسعتوں سے بند کر دیں، نفرتوں اور عداوتوں کو پس پشت ڈال کر ایک کامیاب زندگی گذاریں، اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس کر کے ان کی تکمیل کریں، اور قرآن وحدیث کو مشعل راہ بنا کر ایک رشک ملائک معاشرہ کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کریں۔

زیر نظر کتاب میں اسی احساس وشعور کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اگر ہم آج تک اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتتے رہے ہیں تو آیئے! عہد کریں کہ اب ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ انشاءاللہ

بیت العلوم
Bait-ul-Uloom

ہیڈ آفس: ۲۰- نابھہ روڈ چوک پرانی انار کلی - لاہور فون: 7352483
برانچ: دکان نمبر ۱۴ الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ ۴۰ اردو بازار لاہور فون: 7235996
www.baituluuloom.com